سرپرست : مولانا وحید الدین خاں

ایڈیٹر : ظفر الاسلام خاں ایم اے

چپ رہنا سیکھو، تاکہ تم فرشتوں کی سرگوشیوں کو سن سکو۔

اپنی قوتوں کو عمل میں لاؤ، تم خدا کی مدد کے مستحق ٹھہرو گے۔

جس دل میں بندوں کی محبت نہ ہو، وہ خدا کی محبت سے بھی خالی ہوگا۔

لوگوں کو حقیر نہ سمجھو، ورنہ تم لوگوں کے خالق کی نظر میں حقیر ہو جاؤ گے۔

جو ارباب جاہ کی قربت ڈھونڈتا ہے، وہ خدا کی قربت سے دور ہو گیا۔

کوئی شخص تم کو پتھر مارے تو اس سے لڑنے میں وقت ضائع مت کرو، بلکہ اپنے آپ کو اتنا اونچا اٹھاؤ کہ پتھر مارنے والے کا پتھر وہاں تک پہنچ ہی نہ سکے۔

جو لوگ دوسروں کی شکایت کرتے ہیں وہ صرف اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ زندگی کی دوڑ میں وہ دوسروں سے پیچھے ہو گئے۔

جلد ۱ شمارہ ۲	زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے، خصوصی تعاون: کم سے کم ایک سو ایک روپیہ	دسمبر ۱۹۷۶

تعاون فی پرچہ: دو روپیہ — بیرون ہند سے سالانہ: بیس ڈالر

ستمبر ۱۹۷۶ کی ۲۶ تاریخ تھی اور ساڑھے دس بجے کا وقت۔ عید کی نماز ختم ہو چکی تھی میں جامع مسجد دہلی کی مشرقی سیڑھیوں سے ایک حیرت ناک منظر دیکھ رہا تھا۔

ایک طرف شاہجہانی مسجد اپنی تین سو سالہ عظمتوں کو لئے ہوئے کھڑی تھی۔ سامنے لال قلعہ کی اونچی دیواریں افق کو چھو رہی تھیں۔ درمیان میں ہرا بھرا پارک اور سرخ پتھروں سے بنا ہوا مینا بازار ـــــ اور پھر حد نظر تک تمام سڑکوں اور راستوں میں انسانوں کا حرکت کرتا ہوا سمندر، جو نماز عید سے فارغ ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں کو واپس جا رہا تھا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ایک تاریخ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ جامع مسجد، لال قلعہ اور مینا بازار کا یہ مجموعہ دہلی کا مرکز تھا۔ ہر قسم کی مذہبی، سماجی اور اقتصادی سرگرمیاں یہاں سے شروع ہو کر دارالسلطنت میں پھیلتی تھیں اور پھر پورے ملک کو متاثر کرتی تھیں۔ مگر حالات نے دھیرے دھیرے اس کو ڈھک لیا تھا۔ حکومت نے از سر نو اس پورے علاقے کی صفائی کرائی اور اس کی تزئین و تعمیر کر کے اس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ ملک کی عظیم ترین تاریخ دوبارہ مسلمانوں کے نام الاٹ کر دی گئی۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ مسلمان ان ملے ہوئے مواقع کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ لا یعنی مشغولو اور پر جوش تقریروں میں انھیں ضائع کر دیتے ہیں یا ان کو ایک نئی تعمیر کا عنوان بناتے ہیں۔ ہر نیا موقع بیک وقت دو نوں امکان لے کر آتا ہے۔ یہ مواقع پانے والوں کے عزم و ہمت کا امتحان ہے کہ دونوں میں سے کس امکان کو وہ اپنے لئے واقعہ بناتے ہیں۔

وہ ابھی تک دستکاری کے دور میں ہیں

وہ لوگ جو اپنے کو اردو کا امین اور وارث سمجھتے ہیں، ان کے اندر ایک عجیب و غریب خصوصیت ہے جس میں شاید ساری دنیا میں کوئی ان کا ثانی نہیں۔ وہ کسی گروہ کی برائیوں کو لے لیتے ہیں اور اچھائیوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔

انھوں نے انگریزوں سے ان کی تہذیب لی، مگر ان کی سائنس نہ لی۔ نوآبادیاتی ماحول سے سیاست لی مگر تعمیر نہ لی۔ عیسائیوں سے مناظرہ بازی لی مگر مشنری اسپرٹ نہ لی۔ وغیرہ وغیرہ

اسی سلسلے کی ایک مثال یہ ہے کہ اردو کی قوم نے ایرانیوں سے ادبی لفاظی اور شاعرانہ تخئیل تو اتنی زیادہ لی کہ پوری زبان اس کے سانچے میں ڈھل گئی، مگر جدید دور میں جب ایرانیوں نے کتابت کے طریقے کو چھوڑ دیا اور اس کو آرٹ کے لئے خاص کرتے ہوئے اپنی عام چھپائی کے لئے عربی ٹائپ کو معمولی ترمیم کے ساتھ اختیار کرلیا تو اردو والوں نے اس دوسرے معاملہ میں ایران کی نقل نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو آج دنیا کی تمام زبانوں میں سب سے زیادہ پس ماندہ زبان ہے۔ عربی، فارسی اور ہندی جو اردو کی جدی زبانیں ہیں ٹائپ اختیار کرکے ترقی کر رہی ہیں، اور اردو مشینی عہد میں بھی اب تک دستکاری کے دور سے گزر رہی ہے۔ اردو کی ترقی میں اس کے مزاج پر ادبیت کے غلبہ کے بعد دوسری سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ابھی تک اس میں ٹائپ کا رواج نہ ہو سکا۔ ٹائپ کا مطلب کتابت کو مشینی ضرب دینا ہے۔ ایک ماہر کاتب کے عمل کو جب ٹائپ میں ڈھال دیا جائے تو اتنے ہی وقت میں لاکھوں صفحے اسی خوش نمائی کے ساتھ کمپوز کئے جا سکتے ہیں جتنی دیر میں کاتب نے ایک صفحہ لکھا تھا۔

خوش قسمتی سے اردو کے لئے ہم کو نیا ٹائپ ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ عربی اور فارسی کا ٹائپ معمولی تبدیلی کے بعد اردو میں نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال ہو سکتا ہے۔

عربی ٹائپ کو اردو کے لئے اختیار کرنے کا مزید
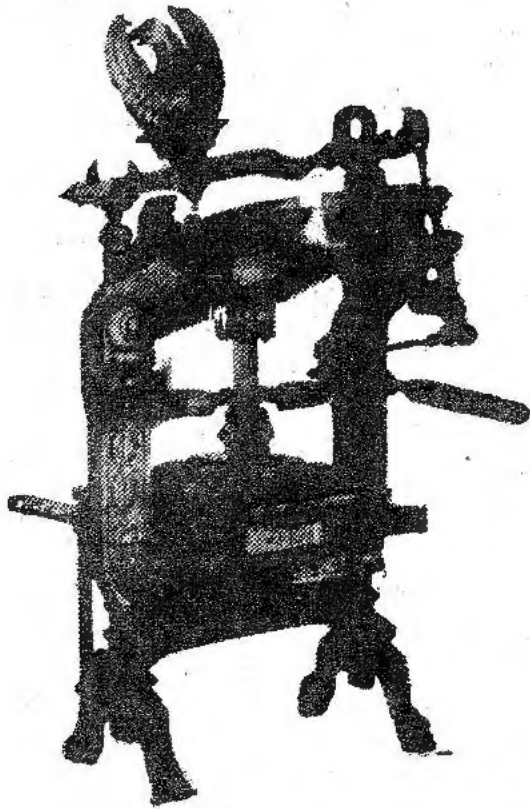
جو لوگ زندگی کی دوڑ میں پیچھے ہو جائیں، وہ صرف تاریخ کا موضوع بن کر رہ جاتے ہیں جس طرح دو سو برس پہلے کا یہ ہینڈ پریس اب صرف میوزیم میں دکھائی دیتا ہے۔

ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ قرآن کا رسم الخط اور ہماری مادری زبان کا رسم الخط دونوں ایک ہو جاتے ہیں مگر یہ دوطرفہ خوش قسمتی بھی ہمارے لئے کسی اقدام کا محرک نہ بن سکی۔

الرسالہ کے پروگراموں کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ دہلی یا کسی دوسرے مرکزی مقام پر عربی ٹائپ کا پریس قائم کیا جائے۔ ہندوستان میں ایک اچھے عربی پریس کی شدید ضرورت ہے۔ یہ پریس نہ صرف عربی کتابوں کی طباعت کی ضرورت کو پورا کرے گا۔ بلکہ الرسالہ اور دوسری اردو کتابوں کو ٹائپ میں چھاپنے کا اہتمام بھی کرے گا۔ ہماری تمنا ہے کہ وہ دن آئے جب ادارہ الرسالہ کی ساری چیزیں ٹائپ میں چھپ رہی ہوں۔ ہمارا یہ اقدام شاید اس دور کا آغاز بن جائے جب کہ اردو زبان کا تمام کام ٹائپ میں ہونے لگے، اور دوسری لسانی قومیتوں کی طرح ہم دستکاری کے دور سے نکل کر سائنس کے دور میں پہنچ چکے ہوں۔

اردو قوم کی ایک عجیب وغریب خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ خرید کر پڑھنا نہیں جانتی۔ ایک "رسالہ" اگر کسی کو پسند آجائے تو اگلے دن ایڈیٹر کو ایک خط ملے گا جس میں رسالہ کی تعریف کے بعد فرمائش ہوگی کہ اس کے "ادارہ" کو رسالہ اعزازی طور پر جاری کر دیا جائے۔ اس کی پسندیدگی اس کے لئے اس بات کا محرک نہیں بنے گی کہ وہ خود باقاعدہ خریدار بنے اور دوسروں کو اس کا خریدار بنائے۔ وہ اعزازی پرچہ کے حصول کے لئے ایک خط لکھ دینا کافی سمجھتا ہے اور بس۔

اردو کی ترقی میں یہ دوسرا عامل بھی اتنی ہی بڑی رکاوٹ ہے جتنا کہ پہلا عامل۔

ملی تعمیر کا کام
سب سے پہلے
ملت کے افراد میں
شعور پیدا کرنے کا کام ہے
اس کی
بہترین صورت یہ ہے کہ
الرسالہ کو
ایک ایک بستی اور
ایک ایک گھر میں
پہنچایا جائے۔

پانچویں نہ بنو، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے

ایک حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کن عالما او متعلما او مستمعا او محبا ولا تکن الخامس فتھلک
تم علم کو جاننے والے بنو یا علم کو سیکھنے والے یا علم کو سننے والے یا علم سے محبت کرنے والے،
اور پانچویں نہ بنو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

اس حدیث میں علم سے مراد وہ علم ہے جو آدمی کو اللہ اور اللہ کی باتوں سے باخبر کرے۔ لوگوں میں کوئی پڑھا لکھا ہوتا ہے، کوئی جاہل۔ کوئی ذہین ہوتا ہے کوئی غبی۔ اس لئے آدمیوں کی مختلف حالت کے اعتبار سے آپ نے چار درجے مقرر کر دیئے۔ اور فرمایا کہ ہر حال میں تم کو ان چار درجوں میں سے کسی ایک درجہ پہ ہونا چاہئے۔

یا تو تم وہ شخص بنو جس نے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کر کے دین خداوندی کو بخوبی سمجھ لیا ہو اور اس کے لئے وہ ضروری محنت و ریاضت کر لی ہو جو آدمی کو صحیح معرفت تک پہنچاتی ہے۔ اگر یہ مقام تم کو حاصل نہ ہو تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ تم اپنی اس کمی سے آگاہ ہو اور اس کو پورا کرنے کے لئے علم حقیقی کو سیکھنا شروع کر دو، قرآن وسنت کے طالب علم بن جاؤ۔ اگر تم اپنے حالات کے لحاظ سے یہ بھی نہ کر سکو تو تیسرا درجہ یہ ہے کہ تمھارے اندر اس واقعہ کا اعتراف پیدا ہو جائے کہ تم نہ صاحب علم ہو نہ طالب علم۔ ایسی حالت میں تمھارے لئے صحیح رویہ یہ ہے کہ تم سننے والے بن جاؤ۔ جہاں کہیں خدا کی باتیں ہوں، تم وہاں خاموشی سے بیٹھو اور جو کچھ بتایا جا رہا ہو اس کو غور سے سنو۔ پھر اگر کوئی اس درجہ پر بھی نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنی اس محرومی کا احساس کرے۔ اور اس احساس محرومی کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں ان لوگوں کے لئے محبت پیدا کرے جو اس متاع علم میں اپنا حصہ پائے ہوئے ہیں جس سے وہ اپنا حصہ نہ پا سکا۔ یہ چوتھا درجہ ہے جہاں کوئی مومن اس دنیا میں ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد جو پانچواں درجہ ہے وہ ہدایت کا نہیں بلکہ گمراہی کا درجہ ہے۔ وہ یہ کہ آدمی علم حقیقت سے باخبر نہ ہو، اس کے باوجود بحث و نزاع کرے، وہ علم دین کے بجائے کسی اور علم کا متعلم بن جائے۔ وہ سننے اور سیکھنے کے لئے ان مجالس کا انتخاب کرے جہاں دین کی باتیں نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ اس کے دل میں محبت و احترام بھی ان لوگوں کے لئے ہو جائے جو علم دین کے مالک تو نہیں ہیں البتہ دوسری قسم کی مہارتوں میں کمال رکھتے ہیں یہ انسان کی پانچویں حالت ہے اور جو اپنے آپ کو اس حال پر پائے اس کو سمجھنا چاہئے کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ الا یہ کہ وہ واپس لوٹے اور مذکورہ چار میں سے کوئی ایک بننے کی کوشش کرے۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

وہ سچائی کے ایک معلم کا انتظار کر رہے تھے، مگر جب سچائی کا معلم آیا تو انھوں نے اس کو نہ ماننے کے لئے طرح طرح کی دلیلیں تلاش کر لیں

۱۹۴۷ کا واقعہ ہے۔ ایک بدوی قبیلہ کے کچھ افراد شرق اردن کے علاقہ سے فلسطین کی طرف جا رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس کچھ غیر قانونی اشیاء تھیں، اس لئے انھوں نے عام گزرگاہ کو چھوڑ کر پہاڑی راستہ سے فلسطین میں داخل ہونا چاہا۔ اس سفر میں وہ بحر مردار کے شمال مغربی کنارے پر پہنچ گئے جس کو وادی قمران کہا جاتا ہے۔ یہاں وہ کچھ دیر آرام لینے کے لئے رکے۔ انھیں قریب کی پہاڑی میں ایک کھوہ نظر آیا۔ ان میں سے بعض افراد کھوہ کے اندر گھسے۔ حیرت انگیز طور پر انھوں نے پایا کہ کھوہ کے اندر کچھ مٹی کے برتن رکھے ہوئے ہیں۔ وہ ان کو نکال کر باہر لائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے اندر شاید قدیم زمانہ کے سکے ہوں گے۔ مگر ان کے اندر سکوں سے بھی زیادہ قیمتی چیز تھی۔ یہ بائبل کے ابواب تھے جو قدیم طرز کے طوماروں میں لکھے ہوئے تھے اور ان کو حفاظت کی غرض سے ان برتنوں میں بند کر دیا گیا تھا۔

بدووں نے اولاً اس کو فلسطین کے ایک مسلم شیخ کے سامنے پیش کیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ سریانی زبان کا کوئی مخطوطہ ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ کئی آدمیوں کے پاس ہوتے ہوئے یروشلم کے ایک یہودی کے پاس پہنچے۔ یہودی نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ یہ عبرانی زبان میں ہے اور اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کے کچھ اجزاء کو خرید لیا۔ اس وقت سے اب تک ان کے بارے میں علماء کے درمیان زبردست بحث و تحقیق جاری

گول لپیٹے ہوئے چمڑے کے مسودات
جو برتن کے اندر رکھے ہوئے ملے ہیں۔

رہی ہے۔ یہ کام تمام تر یہودی اور مسیحی علماء نے کیا ہے مسلمانوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ متعدد ہاتھوں میں گردش کرنے کے بعد اب یہ تاریخی ذخیرہ یروشلم میں اسرائیل کے قبضہ میں ہے۔

چمڑے کے یہ طومار تعداد میں گیارہ ہیں جن میں کل سات کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ ان کی زبان عبرانی ہے۔ ان میں سے اکثر کتابیں مثلاً یسعیاہ، حبقوق وغیرہ موجودہ بائبل میں شامل ہیں، جو دسویں صدی عیسوی میں مرتب کی گئی تھی۔ دونوں کے متن میں بنیادی یکسانیت کے باوجود مکمل یکسانیت نہیں ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ قدیم زمانہ کے کچھ یہودی علماء نے بائبل کے متن کو محفوظ کرنے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی تھی۔ سائنسی طریقوں سے ان کی عمر کا جو اندازہ کیا گیا ہے اس کے مطابق علماء نے ان کا زمانہ ۷۰ ـ ۶۷ مقرر کیا ہے۔ یہ اتنے نازک ہو چکے ہیں کہ جب ان کو کھولنے کی کوشش کی گئی تو ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

یہ طومار جن کو "ڈیڈسی اسکرولز" کہا جاتا ہے،

ثابت کرتے ہیں کہ پہلی صدی عیسوی کے یہودی ایک آنے والے نبی کے منتظر تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ موسیٰ کے بعد دو خاص نبی اور آنے والے ہیں ایک "مسیح" دوسرا "سچائی کا معلم"۔ مسیح "آخری دور میں آنے والے پیغمبر کی راہ ہموار کرے گا" اور سچائی کا معلم "بدروحوں کو ختم کرے گا، وہ آخری دنوں میں آئے گا"۔ حبقوق نامی کتاب کے مسودے میں آنے والے "سچائی کے معلم" کے سات براہ راست حوالے شمار کئے گئے ہیں۔

ڈیڈ سی اسکرول پر جن علماء نے تحقیقات کی ہیں ان کے لئے اب تک سب سے زیادہ مشکل مسئلہ یہ رہا ہے کہ "سچائی کا معلم" سے مراد کون ہے۔ اس سلسلے میں

مختلف نظریات قائم کئے گئے ہیں مگر ابھی تک علماء کا کسی ایک رائے پر اتفاق نہ ہو سکا، ان کے نزدیک مسیح کو اس کا مصداق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ مسودات صاف لفظوں میں "سچائی کے معلم" کو مسیح سے الگ ایک شخصیت قرار دے رہے ہیں، دوسری کوئی مذہبی شخصیت پچھلے دو ہزار برس کے اندر، انھیں نہیں ملتی جس پر وہ عظیم اوصاف چسپاں ہوتے ہوں جو سچائی کا معلم کے لئے مسودات میں بتائے گئے ہیں۔ ان کے مطابق "آنے والا سچائی کا معلم دنیا سے بدروحوں کو ختم کرے گا، وہ خدا کی شریعت کو ہمیشہ کے لئے بگاڑ سے محفوظ کر دے گا، وہ خدا کی ابدی سچائی کا اظہار کرے گا، اس کا جلال قیامت تک ختم نہ ہو گا، وغیرہ۔ یہ الفاظ جس شخصیت پر چسپاں ہوتے ہیں، وہ بلاشبہ وہی ہے جس کو کارلائل نے پیغمبروں کا "ہیرو" قرار دیا ہے، مگر انھوں نے پہلے سے فرض کر لیا ہے کہ یہ شخصیت بہر حال اس ذیل میں نہیں آتی۔

واضح ہو کہ عہد نامہ قدیم کی اکثر کتابیں آٹھویں اور تیسری صدی قبل مسیح کے درمیان قلم بند کی گئیں۔ مگر ان تمام کتابوں کے اصل مسودات ضائع ہو چکے ہیں۔

"ڈیڈ سی اسکرول" کی ایک اہمیت، علماء کے قیاس

کے مطابق ہے یہ ہے کہ شاید ان میں سے بعض متعلقہ کتاب کا اصل ابتدائی مسودہ ہو۔

تاریخی طور پر اس سوال کا جواب ممکن نہیں کہ حضرت سلیمان کے بعد کے دور میں جب اسرائیل اور یہوداہ کی سلطنتیں برباد ہوئیں تو بائبل کے اصل مسودات کس طرح محفوظ رہے اور ان کی موجودہ نقلیں کس حد تک اصل کے مطابق ہیں۔

تیسری صدی قبل مسیح کے بعد اکثر یہودی فلسطین سے منتشر ہو کر دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ ان کی نسلیں عبرانی زبان بھول گئیں۔ دوسری صدی قبل مسیح میں بائبل کا یونانی ترجمہ تیار کیا گیا۔ اس ترجمہ کے بھی اب صرف نقل در نقل نسخے دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

بعد کے دور میں بائبل کے جو قلمی نسخے رائج ہوئے ان میں بہت اختلافات تھے۔ دسویں صدی عیسوی میں کچھ یہودی علماء نے ان مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک مستند متن تیار کیا۔ اسی کا نام آج عہدنامہ قدیم ہے۔

ہمارے اور آخرت کے درمیان صرف ایک غیر یقینی دیوار حائل ہے

چنالا (دھنباد) میں ایک پرانی کوئلہ کی کان تھی جو ۱۹۴۵ سے بند تھی۔ ساڑھے چار سو فٹ گہری اس کان میں دھیرے دھیرے پانی بھر گیا۔ اس سے ۸۰ فٹ کے فاصلہ پر دو سال پہلے ایک اور کان کھودی گئی۔ عالمی بنک اور بیرونی ماہرین کی مدد سے تیار کی ہوئی یہ کان جدید طرز کی مشینوں سے آراستہ تھی۔

۲۷ دسمبر ۱۹۷۵ کو اس کان میں ایک بھیانک حادثہ ہوا۔ دونوں کانوں کے درمیان ۸۰ فٹ کا فاصلہ کافی محفوظ فاصلہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر اچانک اس کے اندر تقریباً ۸ فٹ چوڑا انشگاف ہو گیا اور اس کے اندر سے پرانی کان کا پانی نئی کان میں اتنی تیزی سے داخل ہوا کہ صرف تین منٹ کے اندر نئی کان بھر گئی۔ ۳۷۲ مزدور اور انجنیئر جو اس وقت کان کے اندر کام کر رہے تھے ایک سو ملین گیلن سے بھی زیادہ پانی کے سیلاب میں غرق ہو گئے۔ صرف ایک شخص بھگوان سنگھ (مونگیر) بچا جو حادثہ سے صرف چند منٹ پہلے باہر آ گیا تھا۔

یہ واقعہ حیرت انگیز طور پر ہماری زندگی کی تصویر ہے۔ ہماری موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا کے درمیان موت کی غیر یقینی دیوار حائل ہے۔ ہر آن یہ اندیشہ ہے کہ یہ دیوار ٹوٹ جائے اور آخرت کے حقائق ایک بے پناہ سیلاب کی طرح ہمارے اوپر پھٹ پڑیں۔ اس وقت کوئی زور اور کوئی لفظی بازی گری کام نہ آئے گی۔ آدمی بالکل بے سہارا ہو کر اپنے مالک کے سامنے کھڑا ہوگا۔ وہ سارے لوگ ناکامی اور بربادی کے دائمی جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے جو دنیا کی دلفریبیوں میں اس قدر گم تھے کہ کوئی نصیحت کی بات سننے کے لئے تیار ہی نہ ہوتے تھے صرف وہ شخص بچے گا جس نے مالک کائنات کے سامنے حساب کے لئے پیش ہونے سے پہلے خود اپنا حساب کر لیا ہوگا۔

سب سے زیادہ ہوشیار وہ شخص ہے جو اس آنے والے دن کی تیاری میں اپنے کو لگا دے۔

آپ کے پاس خدا کے فرشتے کھڑے ہوئے ہر وقت بتا رہے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔

ایک بزرگ کو ان کے پڑوسی نے تکلیف پہنچائی۔ وہ اس سے سخت ناراض ہوگئے "اب میں نہ اس سے بات کروں گا اور نہ اس سے تعلقات رکھوں گا" انھوں نے اپنے دل میں سوچا۔ اس کے اگلے دن اتفاق سے ان کے لڑکے سے بھی ان کو ایک تکلیف پہنچی۔ وہ اس سے سخت ناراض ہوئے اور غصہ میں گھر سے باہر نکل آئے۔ رات تک ان کا غصہ جاری رہا یہاں تک کہ وہ سو گئے۔ اگلی صبح کو سو کر اٹھے تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کے دل میں اپنے بچے کے لئے دوبارہ وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو بلایا اور لطف و محبت کے ساتھ اس سے بات کرکے کل کے غصہ کی تلافی کی۔

"اگر میں اپنے لڑکے کا قصور معاف کر سکتا ہوں تو کیا اسی طرح میں اپنے پڑوسی کا قصور معاف نہیں کر سکتا" ان کے دل میں خیال آیا" اور اچانک انھیں محسوس ہوا کہ لڑکے کی غلطی کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں سبق دیا ہے۔" اولاد جن مصلحتوں کے تحت دی جاتی ہے ان میں سے ایک مصلحت شاید یہ بھی ہے کہ انسان کو بتایا جائے کہ وہ کس طرح ایسا کر سکتا ہے کہ ایک قصوروار کا قصور معاف کر دے۔ اگر آدمی کو اولاد نہ دی جاتی تو اس اخلاقی محبت کا عملی سبق کسی اور طرح اس کو نہیں دیا جا سکتا تھا" اس کے بعد انھوں نے اللہ سے معافی مانگی اور اپنے پڑوسی سے مل کر اس کو خوش کیا۔

اگر آدمی کے سینہ میں ضمیر زندہ ہو اور وہ خدا کے سامنے پیش ہونے سے ڈرتا ہو تو اسی طرح ہر دن وہ اپنے گرد و پیش خدا کی آواز سنتا ہے۔ وہ ہر موڑ پر دیکھ سکتا ہے کہ خدا کے فرشتے کھڑے ہوئے بتا رہے ہیں کہ اس کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ آواز صرف ان لوگوں کو سنائی نہیں دیتی جن کے کان خدا کی آواز سننے کے لئے بہرے ہو چکے ہیں۔ وہ خدا کی آواز صرف اس وقت سنیں گے جب اسرافیل کی چنگھاڑ ان کے کان کے پردے پھاڑ دے۔

ایک بزرگ ایک شخص کے یہاں مہمان ہوئے۔ اس آدمی کے گھر سے ملی ہوئی مسجد تھی جس میں نمازی بہت کم آتے تھے۔ بزرگ نے اپنے سکون کی خاطر مسجد میں قیام کو پسند کیا۔ مسجد میں داخل ہونے کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ عرصہ سے اس کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ یہ برسات کا زمانہ تھا۔ اس لئے ٹپکنے سے اور بوچھار سے مسجد کی صفیں جگہ جگہ سے بھیگ گئی تھیں اور ان میں بو بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اگلے دن سورج نکلا تو بزرگ نے ساری صفیں نکال کر باہر دھوپ میں پھیلا دیں۔ مسجد میں خوب صفائی کی۔ اس کے بعد صفوں کو سکھا کر اور جھاڑ کر اپنی جگہ دوبارہ بچھا دیا۔

بزرگ جب پہلی بار مسجد میں داخل ہوئے تھے تو اس کی حالت دیکھ کر انھیں سخت انقباض ہوا تھا۔ اب جو وہ

اس کی صاف ستھری فضا میں بیٹھے تو ان کے دل کو ایک خاص طرح کی خوشی محسوس ہوئی۔ انھوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالے کا شکر ادا کیا کہ اس نے انھیں اس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔

عین اس وقت ان کے میزبان آگئے۔ "اس شخص سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ مسجد کی صفائی کرے" اس کو دیکھتے ہی ان کے اندر یہ احساس ابھرا "یہ دین کے اوپر لمبی لمبی تقریریں کرتا ہے۔ مگر عمل کا یہ حال ہے کہ اپنے پڑوس کے خانہ خدا کو درست نہیں کر سکتا"۔ اس احساس نے بہت جلد ان کے لاشعور میں یہ جذبہ ڈال دیا کہ میں دین میں اس سے زیادہ ہوں۔ میری دین داری کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

دن گزر گیا۔ شام کو وہ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک اجنبی شخص اندر داخل ہوا۔ اس کا دبلا پتلا چہرہ اور اس کے پھٹے کپڑے بتا رہے تھے کہ وہ کوئی غریب مسافر ہے۔ بزرگ نے اس کے سلام کے جواب میں وعلیکم السلام تو کہا مگر دل میں سوچا "یہ شخص بھی کتنا بے وقت آیا ہے، اب اس کے لئے رات کے کھانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ رات بھی شاید وہ اسی مسجد میں گزارے اور میری تنہائی میں خلل ڈالے"۔ ابھی وہ اسی انقباض میں تھے کہ ان کے میزبان مسجد میں داخل ہوئے۔ مسافر کو دیکھ کر انھوں نے فوراً آگے بڑھ کر اس کو سلام کیا، اور مسکراتے ہوئے پوچھا کہاں سے آنا ہوا"۔ پھر اس کے حالات معلوم ہونے کے بعد خود ہی بولے "آج آپ یہیں قیام کریں اور ہمارے ساتھ کھانا کھائیں"۔ میزبان نے یہ ساری باتیں اس طرح کیں گویا یہ نووارد ایک غریب مسافر نہیں، ایک نعمت ہے جو خدا نے اس وقت خصوصی طور پر ان کے لئے بھیج دی ہے۔

اس واقعہ کے بعد بزرگ نے محسوس کیا کہ ان کے دل میں نئی ہلچل پیدا ہو رہی ہے "مسجد کی صفائی کے معاملہ میں میں نے اپنے میزبان پر سبقت کی تھی۔ مگر مسافر کی خدمت کے معاملہ میں وہ مجھ سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے" انھوں نے اپنے دل میں کہا "اگر میرے اندر ایک خصوصیت ہے تو میزبان کے اندر دوسری خصوصیت ہے، اور کیا معلوم مسجد کی صفائی کے مقابلے میں غریب مسافر کی خدمت اللہ تعالے کو زیادہ پسند ہو"۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انھوں نے توبہ کی اور سجدہ میں گر کر اللہ سے دعا کی کہ وہ ان کو اور ان کے میزبان کو ہدایت دے اور اپنی رحمتوں میں حصہ دار بنائے۔

ہماری دنیا فتنوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں ہر وقت اندیشہ ہے کہ آدمی کسی گڑھے میں جا گرے۔ مگر اوپر کے واقعات بتاتے ہیں کہ اللہ نے یہاں بچاؤ اور اصلاح کے بھی بے شمار مواقع رکھ دیئے ہیں۔ اگر آدمی کے اندر ایمانی جذبہ زندہ ہو تو ہر فتنہ کے وقت اس کو اپنے قریب ہی ایک روشنی مل جائے گی جس سے فائدہ اٹھا کر وہ دوبارہ اپنے نجات کے راستہ کو پا سکتا ہے۔ مگر جب ایمان کی چنگاری بجھ جائے تو وہ بچاؤ کے الٰہی انتظام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتا۔ وہ ہر پھسلن پر گرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس آخری گڑھے میں پہنچ جاتا ہے جس سے پھر آدمی کو نکلنا نہیں ہے:

جو خدا سے ڈرنے والے ہیں جب ان پر شیطان کا گزر ہوتا ہے، وہ چونک جاتے ہیں پھر انھیں سوجھ آجاتی ہے اور جو شیطان کے بھائی ہیں، وہ ان کو کھینچے چلے جاتے ہیں پھر وہ کسی طرح نہیں تھمتے۔ (اعراف ۲۰۲)

مطالعہ

ڈاکٹر عبدالعلیم (۱۹۷۶ – ۱۹۰۵) نے برلن کے یہودی اور مسیحی پروفیسروں کے مشورہ سے ایک انگریزی مقالہ لکھا تھا۔ اس کا موضوع تھا "قرآن کا اعجاز"۔ یہ یہ مقالہ ۱۹۳۶ میں کتابی شکل میں شائع ہوا تھا۔

یہی وہ مقالہ ہے جس پر برلن یونیورسٹی نے موصوف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ اگرچہ یہ مقالہ علمی اعتبار سے اتنا ہلکا ہے کہ اس کو مقالہ کے بجائے محض ایک بیان کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

مصنف کا کہنا ہے کہ قرآن کے اعجاز کا عقیدہ محض ایک اذعانی عقیدہ (Dogma) ہے۔ تاہم پورے مقالہ میں خود ان کے اپنے عقیدہ کے حق میں کوئی دلیل نہیں ملتی۔ مقالہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن محمدؐ کے اپنے مذہبی تجربات کا ایک اظہار ہے۔ ایک امی کی زبان سے طاقت ور زبان میں ایک کلام کا تیار ہونا قدیم عرب میں ایک انوکھا واقعہ تھا۔ ان حالات میں یہ بات چل پڑی کہ یہ خدائی کلام ہے اور ایسا کلام کوئی بنا نہیں سکتا۔ قرآن کے چیلنج کے جواب میں کسی نے دوسرا قرآن بنانا چاہا تو اس کو کچل دیا گیا اور اس کے بنائے ہوئے کلام کو بھی مٹا دیا گیا۔ اسود عنسی کے صرف ایک دو فقرے تاریخ میں باقی رہے۔ مسیلمہ اور ابن مقفع کی بنائی ہوئی کچھ آیتیں ملتی ہیں۔ مگر وہ اتنی معمولی ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان نے خود ساختہ فقرے مذاق کے طور پر بنا کر ان کی طرف سے مشہور کر دیئے۔ قرآن کو معجزہ سمجھنے کا یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک وہ جامد عقیدہ بن گیا۔ عوامی نفسیات ہے کہ بے بنیاد افواہیں وقت گزرنے کے بعد تاریخ کا جزء بن جاتی ہیں، اسی طرح یہ عقیدہ بھی تاریخ اسلامی کا جزء بن گیا۔

راقم الحروف کے لئے ناقابل فہم ہے کہ مندرجہ بالا قسم کی کوئی بات کس طرح یہ ثابت کرتی ہے کہ قرآن ایک انسانی کتاب ہے اور اس کے اس چیلنج کی کوئی حقیقت نہیں کہ اس کے جیسی کتاب کوئی نہیں بنا سکتا۔

مصنف کو اعتراف ہے کہ "ایک امی کی زبان سے غیر معمولی طور پر ایک طاقت ور کلام صادر ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس غیر معمولی واقعہ کی کوئی توجیہہ ہونی چاہئے۔ جب انسانی دائرہ میں اس کی کوئی توجیہہ موجود نہیں ہے تو اس کے بعد دوسرا مفروضہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ غیر انسانی ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے۔ اس کے سوا کوئی اور توجیہہ نہ ممکن ہے اور نہ مصنف نے پوری کتاب میں کہیں پیش کی ہے۔

لوگوں کا بنایا ہوا قرآن، مصنف کے دعوے کے مطابق اگر ضائع کیا گیا ہو تو یہ واقعہ بہر حال دور اقتدار میں ہوا ہوگا۔ اسلام کے اقتدار میں آنے سے پہلے ۲۰ سال تک قریش نے اور مخالف عربوں اور یہودیوں نے یہ کام کیوں نہ کیا۔ انھوں نے پیغمبر اسلام کو زیر کرنے کی تمام ممکن صورتیں اختیار کیں۔ مگر یہی ایک تدبیر نہ کی کہ قرآن کے چیلنج کے مطابق قرآن جیسا ایک کلام بنا کر پیش کر دیتے۔ حالاں کہ آپ کو زیر کرنے کا یہ سب سے آسان طریقہ تھا۔ اور بالفرض کسی وجہ سے ماضی کے نادان مخالف اس ممکن تدبیر کو اختیار نہ کر سکے تو آج عربی زبان کے بے شمار ماہرین دنیا میں موجود ہیں، جو، ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کی طرح قرآن کے انسانی کلام ہونے کے مدعی ہیں، انھیں

Dr. Abdul Aleem
Igazul Quran
Aligarh, 1936, pp. 54

کیا چیز رک رہی ہے کہ وہ ایسا کلام بنا کر دنیا کے سامنے رکھ دیں۔ اس طرح وہ اپنے دعوے کو زیادہ بہتر طور پر ثابت کر سکیں گے۔

تاہم زیر نظر کتاب کے صفحہ ۱۸ پر اس کی ایک چھوٹی سی مثال موجود ہے۔ قرآن کی آیت لا یاتون بمثلہ (بنی اسرائیل - ۸۸) کے مفہوم کو مصنف نے اپنے طور پر یعجزون عنہ کے لفظوں میں لکھا ہے

عربی جاننے والوں کے لئے انھیں دونوں فقروں کا تقابل قرآن کے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کیسی عجیب بات ہے، انسان اس ایک فقرے کے مانند بھی کوئی فقرہ وضع نہیں کر سکتا کہ "وہ ایسا قرآن بنا کر نہ لا سکیں گے"، پھر بھی اس کو اصرار ہے کہ قرآن کوئی ادبی معجزہ نہیں۔ سائنسی دور میں اس سے زیادہ غیر سائنسی موقف کی کوئی دوسری مثال نہیں ملے گی۔

وہ خوابوں کے فریب میں مبتلا ہے جو ---

چوتھی صدی ہجری کے آخر میں جب اسپین میں طوائف الملوکی شروع ہوئی اور صوبوں کے گورنر مرکز سے بغاوت کرنے لگے تو چھوٹی چھوٹی بہت سی آزاد حکومتیں بن گئیں۔ مثلاً قرطبہ میں بنو حمود، اشبیلیہ میں بنو عباد، بطلیوس میں ابن افطس، وغیرہ۔ اشبیلیہ میں بنو عباد کی حکومت ۴۱۴ھ میں قائم ہوئی اور ۸۰ برس رہ کر ختم ہوگئی۔ شاہ مراکش یوسف بن تاشفین نے جب اسپین پر چڑھائی کی تو اس کا آخری فرماں روا معتمد بن عباد اشبیلیہ کے تخت پر تھا۔ ۴۸۴ھ میں اس نے معتمد کو گرفتار کر لیا اور اس کو مراکش کے ایک مقام اغمات میں قید کر دیا۔ چار سال قید میں رہ کر وہ ۴۸۸ھ میں مرگیا

معتمد بن عباد جس زمانہ میں قید میں تھا، عید کے دن اس کی لڑکیاں اس سے ملنے کے لئے آئیں، اس وقت اس کے غم انگیز تاثرات اشعار کی صورت میں ڈھل گئے۔ چند اشعار یہ ہیں:

فیما مضی کنت بالاعیاد مسرورا   فساءك العید فی اغمات مأسورا

تری بناتك فی الاطمار جائعة   یغزلن للناس ما یملکن قطمیرا

یطأن فی الطین والاقدام حافیة   کانها لم تطأ مسکا و کافورا

قد کان دهرك ان تامره ممتثلا   فردّك الدهر منهیّا و مامورا

من بات بعدك فی ملك یُسرُّ به   فانما بات بالاحلام مغرورا

ماضی میں تو خوشی کے ساتھ عید مناتا تھا، مگر آج اغمات کے قید میں تیرے لئے عید کی کوئی خوشی نہیں۔

تو اپنی بیٹیوں کو دیکھ رہا ہے کہ وہ بھوکی، پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ وہ لوگوں کے لئے سوت کاتتی ہیں اور ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔

وہ کیچڑ میں ننگے پاؤں چلتی ہیں، گویا کہ ان پیروں نے کبھی مشک اور کافور کو روندا ہی نہیں۔

ایک وقت وہ تھا کہ زمانہ تیرے حکم کا تابع تھا، آج زمانہ نے تجھ کو محروم و محکوم بنا دیا ہے۔

تیری اس حالت کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص حکومت پر خوش ہوتا ہے تو وہ خوابوں کے فریب میں مبتلا ہے۔

اور اسے ٹھیکہ مل گیا
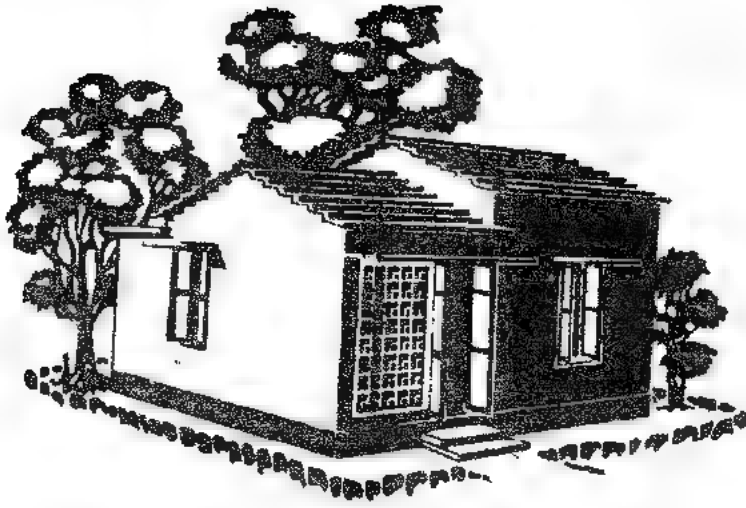
دبئی خلیج فارس کی چھوٹی سی ریاست ہے۔ اس کی آبادی صرف دو لاکھ ہے۔ تاہم وہ تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ دبئی کے شیخ نے منصوبہ بنایا کہ اپنے شہریوں کی رہائش کا انتظام کرنے کے لئے ۲۱۰۰ مکانات تیار کرائیں۔ ہر مکان کا تعمیری رقبہ ۲۵۰ مربع میٹر ہوگا۔ مختلف ملکوں میں اشتہار دیئے گئے۔ دنیا بھر سے تعمیری ٹھیکہ داروں نے اپنی اپنی درخواستیں بھیجیں حتیٰ کہ ان کے نقشوں اور حسابات اور سامان تعمیر کے نمونوں سے کئی بڑے بڑے کمرے بھر گئے۔ مگر سادہ مزاج شیخ کو محسوس ہوا کہ محض نقشوں اور سامانوں کو دیکھ کر ان کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ مطلوبہ گھر کا ایک نمونہ بنا کر دکھائیں۔ تاکہ اندازہ ہوسکے کہ کس حد تک وہ ہمارے معیار کے مطابق ہے اور ہماری ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔ یہ شرط ٹھیکہ داروں کو منظور نہ تھی۔ وہ واپس چلے گئے۔ ان کو محسوس ہوا کہ نمونہ کا گھر بنا کر دکھانے

سے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی درخواست کو واپس لے لیں۔

تاہم پونا (مہاراشٹر) کا ایک ہندستانی انجنیئر ہمت نہیں ہارا۔ اس نے کہا: میں آپ کی مطلوبہ شرط کو پورا کروں گا۔ اس نے شیخ کو بتایا کہ دبئی میں وہ جس قسم کے مکانات چاہتے ہیں، ویسے ہی کئی مکان اس نے مہاراشٹر میں بنائے ہیں۔ یہ مکانات بھی ایرکنڈیشنڈ ہیں۔ وہ خواہ صحرا میں کیوں نہ ہوں ان کے اندر کا درجہ حرارت باہر کی فضا سے دس درجہ سنٹی گریڈ کم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سردیوں میں ان کا درجہ حرارت باہر کی فضا سے دس درجہ سنٹی گریڈ زیادہ۔ اس کے باوجود ان کا تعمیری خرچ عام مکانات سے تقریباً ۱۰ فی صد کم ہوگا۔

ہندستانی انجنیئر مسٹر بالو راؤ جی۔ شرکے نے پیش کش کی آپ اپنے قابل اعتماد افسروں کی ایک ٹیم میرے ساتھ بھیجئے۔ وہ پونا میں چھ کارخانوں کے اندر بنے ہوئے ہمارے مکانات کو دیکھیں۔ اس نے مزید کہا ان کا سفر خرچ ہمارے ذمہ ہوگا۔

اس پیش کش کے مطابق دبئی کے افسروں کی ایک ٹیم ہندستان آئی۔ اس نے یہاں کے مکانات کو دیکھا اور واپس جاکر شیخ کو اس کی رپورٹ پیش کی۔ ۲۲ اگست ۱۹۷۶ کو یہ ٹھیکہ ہندستانی فرم کو مل گیا۔ ٹھیکہ کی رقم ۷۵ کروڑ روپیے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ظاہری حالات ہمیشہ اضافی ہوتے ہیں۔ جہاں لوگ ناامید ہو چکے ہوں، وہاں بھی امید کی ایک صورت موجود رہتی ہے۔ بشرطیکہ کوئی استعمال کرنے والا اس کو استعمال کرنا جانتا ہو۔ ناامیدی کا لفظ، بقول نپولین صرف بیوقوفوں کی ڈکشنری میں پایا جاتا ہے۔

مہابھارت سے

موت کے بعد آدمی سورگ یا نرک میں چلا جاتا ہے وہ دوبارہ اس دنیا میں واپس نہیں آتا۔

"آدمی تپ اس لوک میں کرتا ہے اور پھل دوسرے لوک میں پاتا ہے"

بن پرب، ادھیائے ۹

"(مہابھارت کے) بھاری سنگرہ میں جو مارے گئے، وہ کسی پرکار سے پھر نہیں آسکتے"

شانتی پرب، ادھیائے ۱۷

"راجا نے چوری کی سزا دیتے ہوئے چور کے متعلق حکم دیا کہ دونوں ہاتھ کاٹ ڈالو"

شانتی پرب، ادھیائے ۸

"بیاج کھانے والا ان بھرشٹا کے سمان ہے"

شانتی پرب، ادھیائے ۱۲

"پُن سے پاپ کا ناش ہوتا ہے۔

اس اسار سنسار میں رہنا کسی کو نہیں ہے۔

ایک مکالمہ میں دھرم راج نے دوسرے عالم کو دیکھ کر کہا:

"یہ دھرماتما نرک میں کیوں اور وہ پاپی دریودھن سورگ میں کیوں"

سورگ روہن پرب، ادھیائے ۲

"یہ موہ سورگ کو پراپت کرنے والا نہیں"

بھیشم پرب، ادھیائے ۲

نوٹ: مہابھارت میں صرف جنگ کا قصہ نہیں ہے بلکہ جنگ کے بعد دوسرے عالم میں کس کا انجام کیا ہوا، وہ بھی بتایا گیا ہے۔

وہ مرنے والوں کی یادگاریں کھڑی کرتے رہے حالاں کہ وہ زندوں کی دنیا بھی تعمیر کر سکتے

ہر وہ شخص جس نے "تاج محل" کا نام سنا ہے، اس کے دل میں سنگ مرمر کی اس تاریخی یادگار کو دیکھنے کا چھپا ہوا شوق ضرور موجود رہتا ہے۔ ۱۶ جولائی کو میرے لئے وہ تاریخ آئی جب کہ میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ دہلی سے آگرہ کے لئے روانہ ہوا۔ تارکول کی چکنی سڑک پر ہماری گاڑی چالیس میل کی رفتار سے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ایک سنگ میل تیزی سے گزرتا تا کہ اب منزل کچھ اور قریب آگئی ہے۔

شام کے تین بجے ہم آگرہ میں داخل ہو گئے" اب ہم تاج کے شہر میں آگئے ہیں" یہ احساس میرے دل کی دھڑکنیں تیز کر رہا تھا۔ مگر شہر کی زندگی مجھے معمول کے مطابق دکھائی دی۔ لوگ اپنے اپنے کام میں اسی طرح مشغول تھے جیسے ہر شہر میں ہوا کرتے ہیں، جیسے یہ بات انھیں یاد ہی نہ ہو کہ وہ ایسے شہر میں ہیں جہاں دنیا کا

ایک مغربی سیاح ہندستان آیا اور ملک کی دوسری یادگار بزرگوں کے ساتھ تاج محل کو بھی اس نے خاص طور پر دیکھا۔ واپسی کے بعد اس نے اپنا جو سفرنامہ شائع کیا، اس میں لکھا تھا: "تاج محل کے دونوں طرف دو مسجدیں ہیں"۔
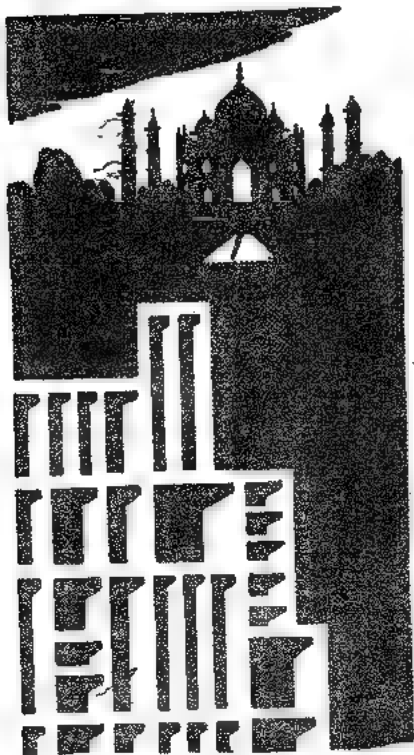
ظاہری مشاہدہ کے اعتبار سے اس کی بات صحیح تھی۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تاج محل کے پہلو میں صرف ایک مسجد ہے۔ مگر عمارتی توازن قائم رکھنے کے لئے یہ کیا گیا ہے کہ مسجد کے مقابل سمت میں ٹھیک اسی شکل کا ایک اور ڈھانچہ کھڑا کر دیا ہے۔ یہ دوسری عمارت مسجد نہیں ہے۔ اگرچہ بظاہر دیکھنے والے کو وہ مسجد ہی جیسی نظر آتی ہے

یہ واقعہ اس دور کی ایک یادگار ہے جب کہ عمارتوں میں توازن و تناسب کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اب مغربی ذوق نے اس کے برعکس طرز تعمیر کو ساری دنیا میں رواج دے دیا ہے۔

قدیم طرز تعمیر میں دو طرفہ توازن اور یکسانی عمارتی حسن کا ضروری جزو تھا۔ اب عدم توازن اور عدم یکسانیت کسی عمارت کے حسن کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ تعمیری یکسانی کی جگہ تعمیری عدم یکسانی نے لے لی ہے۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

اس تصویر میں اوپر تاج محل ہے۔ اور نیچے جدید وضع کی کئی منزلہ عمارت

سب سے بڑا عمارتی عجوبہ کھڑا ہوا ہے۔ تاج محل کے سامنے پہنچا تو آنے جانے والے زیادہ تر بیرونی سیاح تھے۔

"تاج شاید صرف ان لوگوں کے لئے تاج ہے" میں نے سوچا "جنھوں نے ابھی تاج کو نہ دیکھا ہو۔ جس نے ایک بار تاج کو دیکھ لیا ہو، اس کے لئے تاج کی کوئی اہمیت نہیں"۔

تاج محل شاہجہاں (۱۶۵۸-۱۶۲۷) نے بنوایا تھا۔ یہ شاہجہاں کی بیگم ممتاز محل کا مقبرہ ہے جو ۱۵۹۲ میں پیدا ہوئی۔ شاہجہاں سے اس کا نکاح ۱۶۱۲ میں ہوا۔ چودہ بچوں کی پیدائش کے بعد ۱۶۳۱ میں اس کی وفات ہوگئی۔

تاج محل کی تعمیر ۱۶۳۱ میں شروع ہوئی اور ۱۶۵۳ میں وہ بن کر تیار ہوا۔ پہلے اس میں ممتاز محل دفن کی گئی تھی۔ اس کے بعد جب شاہجہاں کی وفات ہوئی تو اس کو بھی اس کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ دونوں کی قبریں ساتھ ساتھ ایک تہ خانہ کی سی غیر جاذب کوٹھری میں بنی ہوئی ہیں اور اس کے اوپر وہ عظیم الشان عمارت ہے جو تاج محل کے نام سے مشہور ہے۔

تاج محل کو دیکھ کر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ ۲۲ برس میں بن کر تیار ہونے والی یہ عمارت بلاشبہ آرٹ کا ایک نمونہ ہے۔ مگر کاش وہ تعمیر اسلام کا ایک نمونہ ہوتا۔ ایک عورت کی قبر کے لئے اتنی عظیم الشان عمارت کھڑی کی گئی ہے، حالاں کہ انھیں پتھروں سے ایک عظیم ملی ادارہ بھی بنایا جاسکتا تھا۔ رشید رضا مصری ستر برس پہلے ہندستان آئے تو انھوں نے کہا تھا کہ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی سلطنت ایک ہزار برس تک رہی، مگر یہاں شاہی دور کی کوئی بڑی درس گاہ نہیں۔ مگر جن لوگوں کو قبر گاہ بنانے سے دل چسپی ہو، وہ ملت کی زندگی کے لئے درس گاہ کب تعمیر کرسکتے تھے

شاعری اور تصنیف کا فرق

ایک شاعر دو گھنٹہ تک قلم کاغذ میں مشغول رہ کر ایک عدد "غزل" کا خالق بن سکتا ہے مگر ایک زندہ اور مؤثر کتاب اسی وقت وجود میں آتی ہے جب کہ برسوں تک اس کے لئے علمی اور تحقیقی جد و جہد کی گئی ہو۔

ایک بہت بڑے شاعر کو میں نے ایک بار دیکھا۔ وہ ایک غزل لکھ رہے تھے۔ غزل کا آخری لفظ تھا:
"انساں بنا دیا"۔ میں نے دیکھا کہ کاغذ کے کنارے انھوں نے بہت سے ہم وزن الفاظ لکھ رکھے ہیں۔ مثلاً گلستاں، چمنستاں، زنداں، خموشاں، ویراں، بہاراں وغیرہ۔ ان الفاظ کو ذہن میں رکھ کر مضامین سوچتے ہیں اور جب کوئی مضمون اس ردیف وقافیہ میں ڈھل جاتا ہے تو اس کے بعد اسے کاغذ پر لکھ لیتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دو گھنٹے کے بعد وہ اس پوزیشن میں تھے کہ مشاعرہ میں یہ کہہ سکیں کہ: "تازہ غزل حاضر ہے"۔

میں نے بزرگ شاعر سے کہا: آپ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیت دی ہے۔ آپ اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ کو تو نثر کی چیزیں لکھنی چاہئیں۔ اس قسم کی شاعری آپ کے شایانِ شان نہیں"۔ انھوں نے جواب دیا: تم سچ کہتے ہو۔ مگر نثر میں لکھنے کے لئے مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت ہے، اور وہ مجھ سے ہوتی نہیں۔ اگر مطالعہ اور تحقیق کے بغیر نثر لکھوں تو ایک پارۂ ادب ضرور تیار ہو جائے گا، مگر ایسی کوئی کتاب نہیں بن سکتی جس کی آج کی دنیا میں قدر و قیمت ہو"۔

یہ شعر کی مثال تھی۔ اب دیکھئے کہ ایک "کتاب" کس طرح لکھی جاتی ہے۔

ایک امریکی لاری کولنس (Larry Collins) اور فرانسیسی ڈامینیک لیپری Dominique Lapierre نے مل کر ہندوستان کی آزادی پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے: "نصف شب کی آزادی" اس کتاب کی تیاری میں ان کے چار سال سے زیادہ لگے۔ انھوں نے لندن کے اخبار ٹائمس میں اشتہار دیا کہ جن لوگوں نے ۱۹۴۰-۴۷ کے درمیان ہندستان میں کام کیا ہے، وہ اپنے پتے سے ہم کو مطلع کریں۔ جواب میں ان کو دو ہزار خطوط ملے۔ انھوں نے ان تمام لوگوں کے پاس اپنی ٹیم بھیج کر انٹرویو لئے اور رپورٹ تیار کی۔ انھوں نے ہندستان، پاکستان اور برطانیہ کے تین سفر کئے اور مختلف جاننے والوں سے مل کر بارہ ہزار انٹرویو تیار کئے۔ ان کی تحقیق اور دستاویزات اور انٹرویو کے کاغذات کا وزن ایک ٹن سے زیادہ تھا۔ مگر ان کے فرانس کے دفتر میں ان کو اس طرح ترتیب سے رکھا گیا تھا کہ ان کی خاتون سکریٹری کسی مخصوص کاغذ کو صرف ایک منٹ میں نکال سکتی تھی۔

اب انھوں نے کتاب لکھنا شروع کی۔ نصف حصہ کالنس نے انگریزی میں لکھا اور بقیہ نصف لیپری نے فرانسیسی میں۔ ہر ایک دوسرے کے لکھے ہوئے کو دیکھتا، اور بے رحمانہ تنقید کرتا۔ جب دونوں مطمئن ہو جاتے تو آخری مسودہ کو ایک مقامی کسان کی بیوی کو پڑھنے کے لئے دیتے۔ اگر خاتون یہ کہتی کہ میں ٹھیک سے سمجھ نہ سکی تو وہ فرض کر لیتے کہ ابھی کچھ غلطی ہے اور اس حصہ کو دوبارہ لکھتے۔ آخری ایک سال انھوں نے روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کیا اور اس طرح اپنی کتاب تیار کی۔

مصنف نے یہ تفصیل بتاتے ہوئے انٹرویور سے کہا:

We lived like hermits,
and we produced ---
'Freedom at Midnight'

ہم نے رہبانوں کی طرح زندگی بسر کی، اور پھر ہم نے اپنی کتاب تیار کر لی ——— اب اگر "غزل" اور "کتاب" کا یہ فرق لکھنے والوں کی زندگیوں میں ظاہر ہو تو ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے، کیوں کہ اسباب کی دنیا میں دو مختلف عملوں کا یکساں انجام نہیں ہو سکتا۔

۳۰ سال پہلے وہ کہتے تھے کہ ہمارے کارخانوں کی چمنیاں جب تک دھواں اگل رہی ہیں، ہمارے لئے کوئی مسئلہ مسئلہ نہیں۔ مگر آج یہ بڑھتا ہوا دھواں ان کی زندگی کے لئے خطرہ بن گیا ہے۔

ڈوئس برگ (Duisburg) مغربی جرمنی کا ایک شہر ہے جو ملک کی لوہے کی صنعت کا مرکز ہے۔ مغربی جرمنی کی لوہے کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ یہیں تیار ہوتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے تک یہاں کے لوگ کہا کرتے تھے کہ ہماری چمنیاں جب تک دھواں اگل رہی ہیں ہمارے لئے کوئی مسئلہ مسئلہ نہیں۔ مگر آج اس علاقہ میں پیسہ کی بہتات کے باوجود "دھواں" "عظیم ترین مسئلہ بن گیا ہے۔ کیونکہ اس نے فضائی کثافت" کا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ ڈوئس برگ مغربی جرمنی کی دو ندیوں کے مقام اتصال پر واقع ہے اس لئے وہ ایک آئیڈیل صنعتی مقام ہے۔ کیونکہ دریاؤں کی وجہ سے نقل وحمل نہایت سستی قیمتوں پر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر کو زبردست ترقی حاصل ہوئی۔ یہاں چمنیوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی رہی۔ مگر دھویں کے اضافہ نے یہاں کی پوری فضا کو کثیف بنا دیا۔ یہاں لوہے کے علاوہ تانبا، کوئلہ، کیمیکلس اور ہیوی انجینیرنگ کی صنعتیں قائم ہیں۔ بیشتر صنعتیں دریائے رین (Rhine) کے کنارے واقع ہیں جو شہر کے مغربی کنارے بہتا ہے۔

مغربی جرمنی کے سامنے اب یہ سوال ہے کہ کم ترقی پر راضی رہ کر اپنی زندگی کو بچائیں یا زیادہ مادی ترقی کی قیمت میں اپنے آپ کو قبل از وقت موت کے منہ میں پہنچا دیں۔ ایک افسر نے کہا:

Do we want to live longer with a Volkswagen or die earlier with a Mercedes

ہم ووکس ویگن پر قانع رہ کر زیادہ لمبی زندگی حاصل کرنا پسند کریں گے یا مرسیڈیز حاصل کر کے پہلے ہی مر جائیں گے

یورپ کی مادی ترقی آج خود اپنے ہی ہاتھوں شکست کھا رہی ہے۔

ڈاکٹر رینی ڈوبوز (Rene Dubos) راک فلر یونیورسٹی نیویارک میں انوائرنمنٹل بایومیڈیسن (Environmental Biomedicine) کے صدر ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے:

So Human an Animal

ڈاکٹر موصوف نے امریکی رسالہ لائف (۲۴ جولائی ۱۹۷۰) کے ایک مضمون میں دنیا کو تنبیہ کی ہے کہ وہ تیزی سے ایک نئے خطرہ کی طرف جا رہی ہے۔ وہ خطرہ یہ کہ نئے حالات انسان کی بہت سی خصوصیات اس سے چھین رہے ہیں۔ اگر اس نے زندگی کی نئی اہلیت اپنے اندر نہ پیدا کی تو مستقبل میں وہ کمتر درجہ کا انسان بن کر جائے گا۔

یہ خطرہ جو حیاتیاتی طبیعیات کی دنیا میں انسان کے لئے موجود ہے، وہی خطرہ اس کے لئے اخلاقی دنیا میں پیدا ہو گیا ہے۔ جدید دنیا میں انسان اپنے اخلاقی

اوصاف کو تیزی سے کھوتا جا رہا ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو بالآخر وہ ایک قسم کا حیوان بن کر رہ جائے گا اور انسانی آبادیوں کی حیثیت ایک نئے قسم کے جنگل سے زیادہ نہ ہوگی۔

"میں یہ سنتے سنتے اکتا گیا ہوں" وہ لکھتے ہیں "کہ انسان فنا (Extinction) کے راستے پر جا رہا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں انسان ایسے خطرات سے دوچار ہے جو فنا سے بھی زیادہ ہولناک ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری ٹکنالوجی اور ہماری بے قید بڑھتی ہوئی آبادیاں نیویارک اور ٹوکیو جیسے شہروں کو غلاظت (Dirt) آلودگی (Pollution) اور شور وغل (Noise) سے بھر رہی ہیں۔ اور یہ سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔

جنگلی جانور چڑیا خانوں میں رہ سکتے ہیں۔ اس قیمت پر کہ وہ اپنی بہت سی فطری خصوصیات کھو دیں۔ اسی طرح انسان بھی اپنی تکنکی تہذیب کے بنائے ہوئے کثیف کٹہرہ میں رہ سکتا ہے۔ مگر ایسی حالت میں ہم اپنی انسانیت کی بہت سی چیزیں قربان کر دیں گے۔

ان کے نزدیک یہ خطرہ انسان کی صلاحیت مطابقت (Adaptabilit) میں ہے۔ فرانسیسی عالم حیاتیات لوئی پاسچر نے ۱۸۶۴ میں تجربہ سے ثابت کیا تھا کہ انسان کے ایک مجموعہ کو اگر ایک ایسے کمرہ میں بھر دیا جائے جس میں ہوا کا گزر کم ہو تو وہ دھیرے دھیرے اس سے مطابقت کر لیتے ہیں حتیٰ کہ اس احساس سے بھی خالی ہو جاتے ہیں کہ وہ کمتر ہوا میں سانس لے رہے ہیں اگرچہ اس مطابقت میں وہ اپنی صحت کا بڑا حصہ کھو دیں گے۔

پاسچر نے ایک چڑیا کو ایک ایسے پنجرے میں رہنے کا عادی بنایا جس میں ہوا بہت کم ملتی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اس کی عادی ہوگئی۔ وہ زندہ تھی اگرچہ ایک غیر متحرک پرندہ کے طور پر۔ اس کے برعکس پاسچر نے اسی پنجرہ میں اچانک ایک اور پرندہ ڈالا تو وہ فوراً مر گیا۔

CONTINUAL EXPOSURE TO NOISE *damages the physical structure of the ear. When incessant, such noise leads to mental stresses that can cause great loss of efficiency.*

مشینی تمدن نے انسان کے لئے جو نئے نئے مسائل پیدا کئے ہیں، ان میں سے ایک مسئلہ "شور وغل" بھی ہے۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ مسلسل شور کان کی طبعی ساخت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس سے دماغی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور انسان کی کام کرنے کی طاقت گھٹ جاتی ہے۔

ڈاکٹر موصوف کے نزدیک کثافت Pollution کا مسئلہ اصلاً یہ مسئلہ نہیں ہے کہ انسان مر جائے گا بلکہ یہ کہ وہ انسانی اوصاف کھو دے گا۔ انسان کی خطرناک حالات سے مطابقت پیدا کر لینے کی صلاحیت اس کے لئے اصل مسئلہ ہے۔ اب انسان یا تو زندگی کی خصوصیات کو ترقی دے گا یا نئے تمدنی حالات میں وہ انسان سے کمتر درجہ کی ایک چیز ہو کر رہ جائے گا:

Man must improve the quality of life, or he may become something less than human

ڈاکٹر چانسی لیک (طبی مرکز کیلی فورنیا یونیورسٹی) نے شور وغل کے مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، وہ بتاتے ہیں کہ شور وغل صرف کان ہی کو تکلیف نہیں دیتا بلکہ اس کی وجہ سے پورے جسم کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے

آواز کی کمی بیشی کو ناپنے کے لئے اس کی ایک اکائی مقرر کی گئی ہے جس کو ڈیسیبل کہتے ہیں۔ اگر بیس فیٹ کے فاصلے پر ایک ٹرک تیزی سے گزر جائے تو اس سے نوّے ڈیسیبلس آواز پیدا ہوگی۔ پانچ سو فیٹ کے فاصلے پر ریل گاڑی سیٹی بجائے تو اس سے بھی نوّے ڈیسیبلس آواز ہوگی۔ زیر زمین ریل گاڑی اگر پچاس فیٹ کے فاصلے پر گزر جائے تو اس سے جو آواز آئے گی وہ پچانوے ڈیسیبلس ہوگی۔ تعمیراتی کاموں کے سلسلے میں جہاں مختلف مشینیں استعمال کی جاتی ہیں وہاں تقریباً ایک سو دس ڈیسیبلس کے برابر شور ہوگا۔

جیٹ ہوائی جہاز جب پانچ سو فیٹ کے فاصلے پر اڑتا ہے تو ایک سو پندرہ ڈیسیبلس کے برابر شور ہوتا ہے۔

شور وغل کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جسم کے اندر پانی اور نمک کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ دیر تک اگر شور ہوتا رہے تو اس سے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک تاثر

دسترخوان پر ایک طرف دودھ، انڈا، سیب جیسی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف چاکلیٹ، پیسٹری اور مٹھائیاں۔ ماں کی ساری کوشش یہ تھی کہ اپنے بچہ کو دودھ، انڈا اور سیب کھلائے۔ مگر بچہ ان کو لینے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا۔ وہ مسلسل چاکلیٹ اور مٹھائیوں پر ہاتھ مار رہا تھا۔

دنیا کا یہ عجیب قانون ہے کہ جو چیز جتنا زیادہ بے فائدہ ہو، اتنا ہی زیادہ وہ لذیذ اور خوبصورت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو اہم اور مفید چیزیں ہیں ان میں نسبتاً کوئی ظاہری کشش نہیں ہوتی۔ شاید قدرت یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ ہم اپنی تمیز کی قوت کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔

تماشے کی باتیں مثلاً شکاریات، فلمی اور جاسوسی کہانیاں، سکینڈل کے سنسنی خیز فیچر، عام انسان کے لئے اپنے اندر بے حد کشش رکھتے ہیں۔ اسی طرح جنگی داستانیں، فتوحات کے قصے، کشف وکرامت کے افسانے لوگوں کو ذہنی شراب کی طرح اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اس کے مقابلہ میں ایسے مضامین جن میں تعمیری سبق دیا گیا ہو، جو واقعاتِ عالم کا سائنسی مطالعہ کرنا سکھاتے ہوں، جو یہ بتاتے ہوں کہ زندگی کو حقیقت پسندانہ بنیادوں پر کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے، ان میں لوگوں کے لئے کوئی دلچسپی نہیں۔ لوگ زہر کی طرف دوڑ رہے ہیں، امرت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے لئے بھی کسی کے پاس وقت نہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے ہی انسان بچے ہیں۔ کوئی عمر کے لحاظ سے بچہ ہے، کوئی سمجھ کے لحاظ سے۔

فریدہ عظیم ایم اے

ایک کو کیچڑ دکھائی دیا، دوسرے کو تارے

ڈیل کارنیگی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے:

How to Stop Worrying and Start Living

اس کتاب میں اس نے جنگ عظیم ثانی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔

ٹامسن ایک امریکی فوجی تھا۔ اس کی ڈیوٹی کیلی فورنیا کے صحرائے موجاوی (Mojave) میں تھی۔ اس کی بیوی (Thelma Thompson) اپنے شوہر سے قریب رہنے کے لئے وہاں گئی اور قریب کی ایک بستی میں مکان لے کر رہنے لگی تھوڑے دنوں رہنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ یہ جگہ اس کی پسند کے بالکل خلاف ہے۔ گرمی، ریت اور آندھی ہر وقت وہاں اس کا استقبال کرنے کے لئے موجود رہتے تھے۔ اس کے ساتھ تنہائی، کیونکہ اس کے شوہر کا بیشتر وقت فوجی گشت میں گزرتا تھا۔ اس کے واحد ساتھی اس کے دیہاتی پڑوسی تھے۔ مگر وہ لوگ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، اس لئے وہ ان سے بھی مانوس نہ ہو سکی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس جگہ کو چھوڑ دے اور اپنے گھر واپس چلی جائے اس نے اپنے والدین کو ایک مایوسانہ خط لکھا اور ان کو بتایا کہ وہ جلد ہی ان کے پاس لوٹ آنا چاہتی ہے۔

اس کے باپ کا جواب آیا۔ مگر وہ بہت مختصر تھا۔ باپ نے اپنے خط میں صرف دو سطریں لکھی تھیں:

Two men looked out from prison bars.
One saw the mud, the other saw the stars

دو آدمیوں نے قید خانہ کے جنگلے سے باہر نظر ڈالی۔ ایک کو کیچڑ دکھائی دیا۔ دوسرے کو تارے۔

ان دو سطروں نے اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسی صحرائی گاؤں میں رہے گی اور یہاں اپنے لئے بہتر زندگی بنائے گی۔ اس نے محسوس کیا کہ جہاں کیچڑ ہیں، وہیں اس کے اوپر ستارے بھی چمک رہے ہیں۔ اس نے "کیچڑ" کے بجائے "ستاروں" کو دیکھنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے مقامی لوگوں میں اپنے دوست بنائے۔ ان کا کلچر اور زبان سیکھی۔ اس نے صحرائی زندگی کی رنگا رنگیوں کو سمجھا۔ اس نے صحرا میں ڈوبتے اور نکلتے ہوئے سورج کے حسن کا مشاہدہ کیا۔ دھیرے دھیرے اس کو اس علاقہ سے اتنی دلچسپی ہو گئی کہ اس کا شوہر جب اپنی فوجی ملازمت سے ریٹائر ہوا تو دونوں نے طے کیا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی اسی مقام پر گزاریں گے حتیٰ کہ اس نئے تجربہ نے مسز ٹامسن کو ایک مصنف بنا دیا۔ اس نے اپنے تجربات کے متعلق ایک کتاب (Bright Ramparts) کے نام سے لکھی جو بے حد مقبول ہوئی اور اس کے کثیر ایڈیشن شائع ہوئے۔

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک مصنف نے لکھا ہے:

The most important thing about suffering is
not what happens to us but how we react to it

زیادہ اہم بات یہ نہیں ہے کہ ہمیں کن مشکلوں سے سابقہ پیش آ رہا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم ان کے مقابلہ میں کس قسم کا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔

ڈاروِن (۱۸۸۲ – ۱۸۰۹) کو یقین تھا کہ زندگی ایک ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ کیڑے مکوڑے اپنے اعضا میں ترقیاتی تبدیلیاں کرتے کرتے بکری بن گئے۔ اور بکری نے ترقی کر کے زرافہ کی صورت اختیار کر لی۔ پچھلے سو برس کے دوران یہ ایک مسلّمہ سائنسی عقیدہ بن گیا تھا۔ مگر حالیہ مطالعہ نے اس عقیدہ کو علمی حیثیت سے متزلزل کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر معلوم ہوا ہے کہ زمین کی عمر اس اندازہ سے بہت کم ہے جو ارتقائی طور پر زندگی کی انواع کو وجود میں لانے کے لئے ضروری ہے۔

اب علمائے حیاتیات کا قیاس یہ ہو رہا ہے کہ زمین سے باہر کائنات کے کسی مقام پر انسان جیسی تہذیب موجود ہے اور اس نے بالقصد زندگی کا جرثومہ اوپر سے زمین پر بھیجا ہے۔ مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ درپیش ہے۔ کائناتی وقت اتنا کافی نہیں کہ اس کے اندر دو تہذیبیں ایک کے بعد ایک ترقی کر سکیں۔ ایک زمین پر، دوسری کسی اور سیارہ میں — گویا انسانی علم وہاں پہنچ گیا ہے جہاں اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ ایک قادر مطلق کے وجود کو تسلیم کر لے۔

ارتقاء کا مفروضہ قافلہ کائنات کی معلوم شاہراہوں میں اپنا راستہ نہ پا سکا
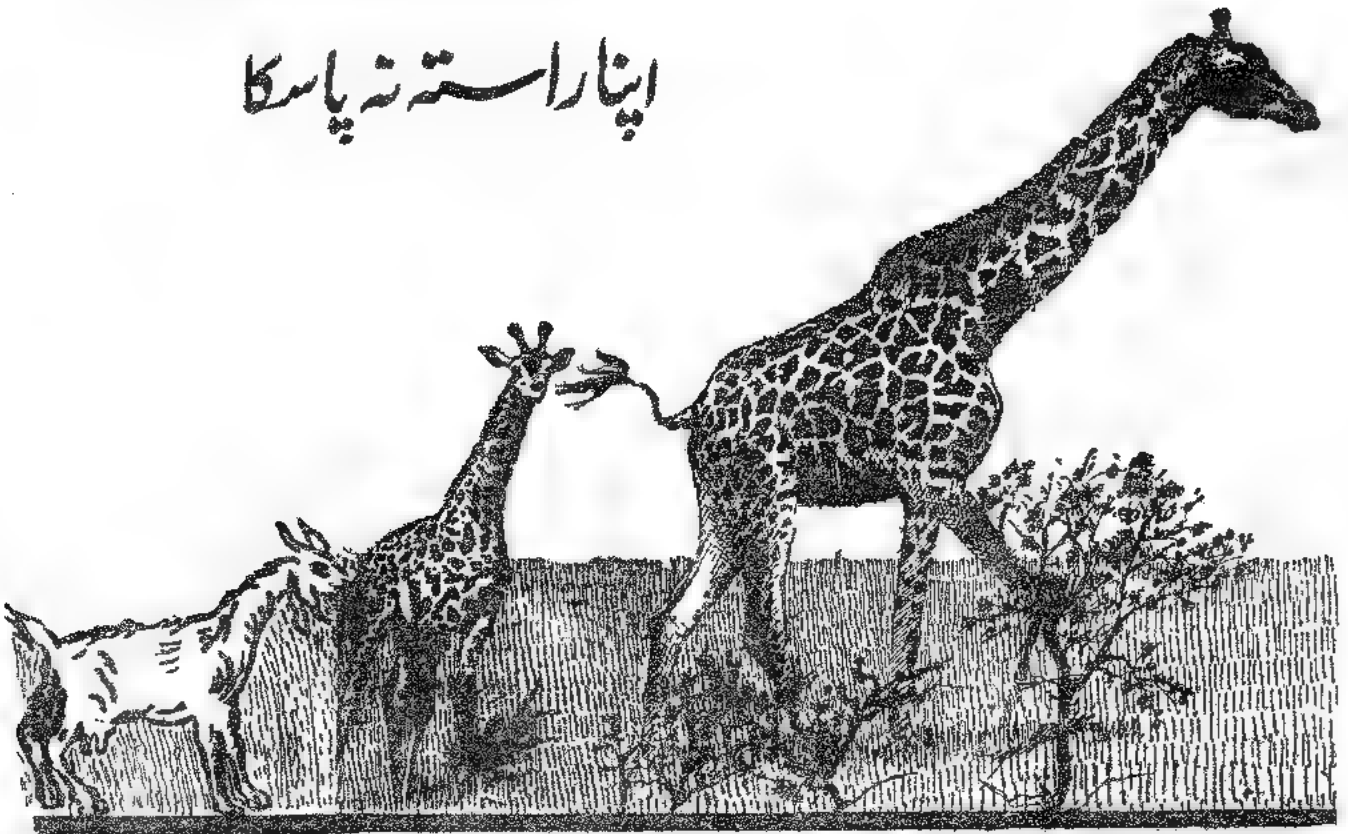
زمین پر زندگی کیسے شروع ہوئی۔ اس کے بارے میں حال ہی میں ایک چونکا دینے والا نظریہ سامنے آیا ہے۔ اس نظریہ کو پیش کرنے والے دو ممتاز مالیکیولر بیالوجسٹ ہیں۔ ایک نوبل انعام یافتہ فرانسس کریک (Francis Crick) دوسرے لزلی آرگل (Leslie Orgel) اس نظریہ کے مطابق زمین پر زندگی کا آغاز نہ تو خود بخود ہوا اور نہ اس طرح کہ کچھ ملین سال پہلے ایک ابتدائی مادہ سے ایک جسم حیوانی (Organism) بنا اور اس سے تدریجی ارتقا کے ذریعے زندگی کی انواع وجود میں آئیں۔ بلکہ زندگی ایک ایسے تجربے کا نتیجہ تھی جو کچھ غیر ارضی ہستیوں (Extra-terrestrial Beings) نے کئی جگ پہلے منظم کیا تھا۔

کریک اور آرگل، یہ فرض کرتے ہوئے کہ ہمارے کہکشانی نظام کے دوسرے سیاروں میں ترقی یافتہ تہذیبیں موجود ہیں، یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی قسم کے کسی سیارہ کے باشندوں نے کچھ ہزار ملین سال پہلے طے کیا کہ وہ اس بات کا تجربہ کریں کہ کیا ان کے پڑوسی سیاروں میں زندگی اپنے لئے نیا ماحول پیدا کر سکتی ہے چنانچہ انھوں نے ہماری کہکشاں کے کچھ سیاروں پر زندگی کے جراثیم ڈالے۔ اسی قدیم تجربہ کا نتیجہ ہماری موجودہ تہذیب ہے۔

انیسویں صدی میں ڈارون کے نظریہ کے بعد اہل مذاہب کا مخصوص تخلیق کا نظریہ علمائے سائنس کے درمیان ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سائنس داں اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں سرگرداں تھے کہ زندگی شروع کس طرح ہوئی۔ اس بحث کے دوران سویڈن کے کیمسٹ ارے نیس (Arrhenius) نے انیسویں صدی کے آخر میں یہ تخیل پیش کیا کہ کچھ بیکٹیریائی اجزاء جو کسی ایسے سیارہ سے جہاں پہلے سے زندگی موجود تھی، زمین پر آگئے اور پھر تدریجی ارتقار کے ذریعہ اقسام حیات کو وجود میں لانے کا سبب بنے۔ ارے نیس نے اس طریق عمل کو "پینس پرمیا" کا نام دیا۔ اس نظریہ کو اس تنقید کا سامنا کرنا پڑا کہ بیکٹیریا بین سیاراتی سفر میں خطرناک ریڈائیشن کے مقابلہ میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ لارڈ کلوین (Kelvin) نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے کہ بیکٹیریا کسی شہابیے سے چپک گیا ہو اور اس پر سوار ہو کر زمین پر آیا ہو۔"

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ بیکٹیریائی اجزاء شہابیے پر سوار ہو کر بین سیاراتی سفر کریں، تاہم پینس پرمیا کا نظریہ کبھی سائنس دانوں کے لئے قابل قبول نہ ہو سکا تھا۔ اس نظریہ کا اساسی مقدمہ یہ ہے کہ زندگی اس سے پہلے کہیں موجود تھی، جب کہ اس نظریہ میں اس کا جواب نہیں ملتا کہ دوسرے سیارہ پر زندگی کیسے وجود میں آئی۔

کریک اور آرگل، یہ مانتے ہوئے کہ بیکٹیریائی اجزاء کی اتفاقی ہجرت ناممکن ہے، کہتے ہیں کہ اس وقت یہ قابل قیاس ہو جاتا ہے جب کہ یہ مانا جائے کہ بالقصد کسی نے زندگی کے جراثیم کو زمین پر بھیجا ہو۔ وہ اس عمل کو معین پینسپرمیا (Directed Panspermia) کا نام دیتے ہیں۔

اس نئے نظریہ کے ثبوت میں کریک اور آرگل دو حیاتیاتی مسئلوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک جینٹک کوڈ ہے۔ ہر ایک موجودہ زمانہ میں تسلیم کرتا ہے کہ زمین پر زندگی کی تمام قسموں کے لئے صرف ایک کوڈ ہے

زندہ جسم اگر محض طبیعی اور کیمیاوی قوتوں کے باہمی عمل سے بن گیا ہو تو اس کی ترکیب میں عناصر کا وہی تناسب پایا جانا چاہیئے جو ہماری دنیا کے اندر موجود ہے۔ مگر زندہ جسم میں زمینی اجزاء کا انعکاس نہ ہونا ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی چیز ہے جس کو کسی بنانے والے نے بالقصد ایک خاص شکل میں بنایا ہے، نہ کہ وہ محض اندھے عمل کا اتفاقی نتیجہ ہے۔

کوئی حیاتیاتی عالم اس عالمگیریت کی توجیہہ نہیں کر سکتا کہ سب کے لئے ایک ہی کوڈ کیوں ہے۔ آرگل اور کریک کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حیات کا ایک ہی بیج تھا، جس سے زندگی شروع ہوئی، اس لئے فطری طور پر اس بیج کا جینٹک کوڈ، جو کئی جگ پہلے کسی دوسرے سیارے کے باشندوں نے زمین پر بھیجا تھا اپنا اعادہ ایک ہی جینٹک کوڈ کی شکل میں کرتا رہا۔

دوسری چیز مولب ڈینم (Molybdenum) نامی دھات کا وہ رول ہے جو حیاتیاتی نظام میں پایا جاتا ہے۔ اکثر انزائم سسٹم اپنی کارکردگی کے لئے اس کے اور صرف اس کے محتاج ہوتے ہیں۔ مولب ڈینم اتنا غیر معمولی طور پر اہم ہونے کے باوجود زمین میں پائی جانے والی کل دھاتوں کا صرف ۰۲ء۰ فی صد (دس ہزار میں دو) ہے۔ دوسری طرف بعض زیادہ مقدار میں پائی جانے والی دھاتیں مثلاً کرومیم اور نکل، جو کہ اپنی خاصیت میں مولب ڈینم سے بہت مشابہ ہوتی ہیں اور زمینی دھاتو کا ۲ء۰ فی صد اور ۱۶ء۳ فی صد ہیں، حیاتیاتی نظام میں بالکل ہی کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ کریک اور آرگل کہتے ہیں کہ زمین کی جو کیمیائی ترکیب ہے وہ زمین پر وجود میں آنے والی زندگیوں کی بناوٹ میں منعکس ہونی چاہئے تھی۔ اور چونکہ ایسا نہیں ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ زندگی کچھ ملین سال پہلے زمین پر باہر سے بھیجی گئی۔

اگر معین پینس پرمیا کا نظریہ مان لیا جائے تو اس سے دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ (۱) کیا کائناتی وقت اتنا کافی ہے کہ اس کے اندر دو تہذیبیں ایک کے بعد ایک ترقی کر سکیں، ایک زمین پر اور دوسری کسی اور سیارہ میں (۲) کیا حیاتیاتی جرثومہ بین سیارتی فاصلوں کو عبور کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ زندہ حالت میں پہنچایا جا سکتا ہے۔

کریک اور آرگل کا خیال ہے کہ ان کا نظریہ قبولیت حاصل کرلے گا، اگر یہ ثابت ہو سکے کہ وہ عناصر جو زمینی زندگی کے اجزائے ترکیبی ہیں، وہ وہی ہیں جو بعض قسم کے ستاروں میں، ان کے قیاس کے مطابق کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

(دو کردار) خوشی اور خفگی دونوں میں وہ انصاف پر قائم رہتے تھے

یرموک کی لڑائی میں خالد بن ولید (م ۶۴۲ھ) اسلامی فوجوں کے سپہ سالار تھے اور ابوعبیدہ بن الجراح ان کے ماتحت افسر کی حیثیت سے جنگ میں شریک تھے۔ حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو انھوں نے خالد بن ولید کو معزول کر کے ابوعبیدہ بن الجراح کو سپہ سالار مقرر کر دیا اور خالد بن ولید کو ان کے ماتحت کر دیا۔ یہ فرمان لے کر مدینہ سے جو شخص روانہ ہوا تھا، وہ مقام جنگ پر اس وقت پہنچا جب کہ طویل مقابلہ کے بعد لڑائی اپنے آخری انجام کو پہنچنے والی تھی اور فتح کے مقدمات ظاہر ہو چکے تھے۔ قاصد نے یہ فرمان اولاً ابوعبیدہ بن الجراح کو دیا۔ ابوعبیدہ فرمان خلافت کے مطابق فوراً سپہ سالاری کا جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے کر فتح کا کریڈٹ وصول کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ خالد بن ولید کی ماتحتی میں بدستور لڑتے رہے:

فاخفی ابوعبیدۃ الخبر وصارفی مکانہ خلف خالد حتی ظہرت مقدمات النصر۔ وقد سئل عن عدم اخذہ لواء القیادۃ علی الفور فقال: ماسلطان الدنیا ارید وماللدنیا اعمل

ابوعبیدہ نے خبر کو چھپایا اور خالد کی ماتحتی میں بدستور اپنے کو باقی رکھا یہاں تک کہ فتح کے مقدمات ظاہر ہو گئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ قیادت کا جھنڈا آپ نے فوراً کیوں نہ لے لیا۔ فرمایا: میں دنیا کی بڑائی نہیں چاہتا اور نہ دنیا کے لئے عمل کرتا ہوں۔

آخرت کے لحاظ سے کریڈٹ یہ تھا کہ خبر کو چھپایا جائے۔ دنیا کا کریڈٹ اس میں ملتا تھا کہ اس کو ظاہر کر دیا جائے۔ ابوعبیدہ نے آخرت کا کریڈٹ لینا پسند کیا اور دنیا کے کریڈٹ کو نظر انداز کر دیا۔

اب خالد بن ولید کے کردار کو دیکھئے۔ یرموک کی فتح کے بعد جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس عظیم جنگ کے فاتح (خالد بن ولید) کو سپہ سالاری سے معزول کر دیا گیا ہے تو ان کے اندر سخت بے چینی پیدا ہو گئی۔ بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے، انھوں نے حضرت خالد کی بہادری اور جواں مردی پر تقریریں کیں اور ان کی معزولی پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان کو ابھارا کہ وہ خلیفہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیں اور وعدہ کیا کہ ہم سب لوگ آپ کا ساتھ دیں گے۔ (یحرضونہ علی عصیان امر الخلیفۃ ویعدونہ بانہم سیکونون معہ) مگر خالد بن ولید نے اس قسم کے مشورہ کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا اور اس پر راضی ہو گئے کہ ابوعبیدہ بن الجراح کی ماتحتی میں ایک معمولی فوجی بن کر اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف لڑتے رہیں۔ اس وقت انھوں نے جو جملہ کہا وہ تاریخ نے ان الفاظ میں محفوظ رکھا ہے:

انا لا اقاتل فی سبیل عمر ولکن فی سبیل رب عمر

میں عمر کی راہ میں جنگ نہیں کرتا، بلکہ عمر کے رب کی راہ میں جنگ کرتا ہوں۔

اس تقسیم کار کا ایک فائدہ یہ بھی ہے

اسلام میں عورت اور مرد کے دائرہ عمل کو الگ الگ رکھا گیا ہے۔ عورت گھر کے لئے اور مرد باہر کے لئے۔ یہ تقسیم نہ صرف اس لئے صحیح ہے کہ حیاتیاتی اور عضویاتی اعتبار سے دونوں صنفوں میں فرق ہے۔ بلکہ اس میں بہت سے اجتماعی فائدے بھی ہیں۔ ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اس تقسیم کے ذریعہ دونوں کو ایسے قابل اعتماد ساتھی مل جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے لئے بہترین مشیر بن سکیں۔

خاندان، نسل انسانی کی اکائی ہے اور معاشرہ اس کا مجموعہ۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ زندگی کے ان دونوں میدانوں میں بار بار ایسے گمبھیر مسائل آتے ہیں جن میں وہ شخص بے لاگ رائے قائم نہیں کر پاتا جو خود مسئلہ کے اندر گھرا ہوا ہو۔ ایسے وقت میں ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کے پاس ایک ایسا مشیر ہو جو خود مسئلہ سے متعلق نہ ہو تاکہ اس کی بابت غیر متاثر ذہن کے ساتھ رائے قائم کر سکے۔

عورت اور مرد کے درمیان تقسیم عمل سے یہ فائدہ بہترین طور پر حاصل ہو جاتا ہے۔ عورت اپنے شعبہ میں مصروف ہوتی ہے اور مرد اپنے شعبہ میں۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے معاملات سے براہ راست طور پر غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔ ہر فریق اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ دوسرے فریق کے معاملہ میں غیر متاثر ذہن کے ساتھ سوچے اور اپنے بے لاگ مشوروں سے اس کی مدد کر سکے۔

اس بات کی وضاحت کے لئے یہاں عورت کی زندگی سے چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر جب غار حرا میں پہلی وحی اتری تو آپ کانپتے ہوئے اپنے گھر تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے کمبل اڑھا دو۔ گھر والوں نے آپ کو کمبل اڑھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب آپ کی دہشت کم ہوئی تو آپ نے اپنی اہلیہ خدیجہ بنت خویلد سے وہ پورا قصہ بیان کیا جو غار حرا کی تنہائی میں آپ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ خدیجہؓ کے اس وقت کے الفاظ جو تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں وہ ایک رفیقۂ حیات کے کردار کی نہایت اعلیٰ مثال ہیں، انھوں نے کہا:

کلا واللہ ما یخزیك اللہ ابدا، انك لتصل الرحم وتحمل الکلّ وتکسب المعدوم وتقوی الضیف وتعین علی نوائب الحق	ہرگز نہیں، خدا کی قسم، اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، گم نام لوگوں کو کماتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کے معاملہ میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قریش مکہ سے وہ معاہدہ کیا جو معاہدۂ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے، تو صحابہ

میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ کیونکہ یہ معاہدہ بظاہر دب کر کیا گیا تھا اور اس میں کئی باتیں صریح طور پر مخالفین کے حق میں تھیں۔ لوگوں میں اس قدر غم و غصہ تھا کہ معاہدہ کی تکمیل کے بعد جب آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ قربانی کے جانور جو تم اپنے ساتھ لائے ہو، یہیں ذبح کر دو اور سر منڈالو۔ تو ایک شخص بھی اس کے لئے نہ اٹھا۔ آپ نے تین بار اپنے حکم کو دہرایا پھر بھی سب لوگ خاموش رہے اور کوئی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ آپ رنج کی حالت میں وہاں سے لوٹ کر اپنے خیمہ میں گئے جہاں آپ کی اہلیہ ام سلمہؓ موجود تھیں۔ انھوں نے آپ کو غمگین دیکھ کر پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ آج وہ ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے مسلمانوں کو حکم دیا مگر ان میں سے کوئی بھی میرے حکم کی تعمیل کے لئے نہ اٹھا۔ ام سلمہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول، اگر آپ کی رائے یہی ہے تو آپ میدان میں تشریف لے جائیں اور کسی سے کچھ کہے بغیر اپنا قربانی کا جانور ذبح کریں اور سر منڈالیں۔ آپ خیمہ سے باہر نکلے اور کسی سے کچھ کہے بغیر اپنی قربانی ذبح کی اور نائی کو بلا کر سر منڈایا۔ جب صحابہ نے یہ دیکھا تو سب نے اٹھ کر اپنی اپنی قربانیاں ذبح کر دیں۔ اگرچہ ان کے رنج و غم کا عالم یہ تھا کہ جب وہ ایک دوسرے کا سر مونڈنے لگے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو کاٹ ڈالیں گے۔

خدیجہؓ اور ام سلمہؓ کو ان نازک مواقع پر جو قیمتی بات سوجھی وہ اس لئے سوجھی کہ وہ اصل معاملہ سے الگ تھیں اور اس بنا پر اس پوزیشن میں تھیں کہ غیر متاثر ذہن کے تحت اس کے بارے میں رائے قائم کر سکیں۔ اگر وہ خود بھی معاملہ میں براہ راست شریک ہوتیں تو اس قسم کی بے لاگ رائے قائم کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہوتا۔

غلطی کا انجام

محمود گواں دکن کی بہمنی سلطنت کا وزیر تھا وہ تاریخ ہند کے لائق ترین مدبروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ اس قدر محنت کا عادی تھا کہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا۔ اپنی ضرورتیں اس نے بہت محدود کر لی تھیں۔ چٹائی پر سوتا، مٹی کے برتن میں کھانا کھاتا اور نہایت سادہ زندگی گزارتا۔ اس کے ذاتی کتب خانہ میں تین ہزار کتابیں تھیں۔ اس نے بہمنی سلطنت کی راجدھانی بیدر میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنی تمام کتابیں وہاں بھیج دیں۔ مدرسہ کی عمارت کے آثار اب بھی بیدر میں موجود ہیں۔ اس کے زمانے میں بہمنی سلطنت کو بہت ترقی ہوئی

محمود گواں کے زمانے میں بہمنی تخت پر محمد شاہ سوم تھا۔ یہ بادشاہ نہایت آرام طلب اور ناکارہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا سارا انتظام عملاً محمود گواں کے ہاتھ میں آگیا۔

دربار کے بہت سے امراء اس کے اس قوت و اثر کو دیکھ کر اس سے جلنے لگے۔ انھوں نے خفیہ طریقہ سے محمود گواں کی سرکاری مہر حاصل کر لی۔ ایک جعلی خط اس کی مہر کے ساتھ تیار کیا جو وجے نگر کے راجہ رائے نرسنگھ کے نام لکھا گیا تھا۔ یہ فرضی خط انھوں نے بادشاہ کو دکھایا اور کہا کہ وزیر غدار ہے۔

بادشاہ امیروں کے دھوکے میں آگیا۔ اس نے ۱۴۸۱ء میں اس لائق وزیر کو قتل کرا دیا۔ بعد کو بادشاہ کو پتہ چلا کہ اس نے غلطی کی ہے۔ اس کو بے حد صدمہ ہوا، یہاں تک کہ خود بھی ایک سال کے اندر مرگیا۔

موت کے بعد آدمی کو وہ سب کچھ مضحکہ خیز دکھائی دے گا

جس کو دنیا میں وہ اہم سمجھتا تھا اور جس کے پیچھے اپنی ساری زندگی لگادی تھی

یہ بات اگرچہ انھوں نے سیاسی اور اقتصادی نظریات کے پہلو سے کہی تھی، مگر موت نے شاید صرف دس سال بعد انھیں بتادیا ہوگا کہ یہ بات ایک اور معنی میں بھی صحیح ہے — موت سے پہلے آدمی اپنی ترقی کے لئے یا اپنی شخصیت کو بنانے کے لئے جو کچھ کرتا ہے وہ موت کے بعد کی زندگی میں بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس کو اچانک معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان چیزوں کی کوئی قیمت ہی نہیں جن کو سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا اور ان کو حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری زندگی لگادی تھی۔

کچھ کام نہ آیا

جنرل فرانسسکو فرینکو (۱۹۷۵-۱۸۹۲) ۳۶ سال تک اسپین کے مطلق العنان ڈکٹیٹر رہے۔ آخر عمر میں ان کو نو قسم کی مہلک بیماریاں لگ گئی تھیں۔ ۳۲ ڈاکٹروں کی شب و روز موجودگی کے باوجود وہ پانچ ہفتہ تک بستر پر تڑپتے رہے اور بالآخر ۱۹ نومبر کو ختم ہوگئے۔ اسپین کی سول وار (۳۸-۱۹۳۶) کے زمانہ میں ہٹلر اور مسولینی کی فوجی مدد سے وہ ملک کے اقتدار پر قابض ہوئے تھے۔ شاہ اسپین الفانسو سیزدہم ۱۹۳۱ میں ملک چھوڑ کر بھاگ

آخری انجام

چو این لائی (۱۹۷۶-۱۸۹۸) چین کے اشتراکی انقلاب (۱۹۴۹) سے پہلے چیانگ کائی شیک کے ساتھی تھے۔ بعد کو وہ چیانگ سے الگ ہوگئے اور کمیونسٹ چین کے پہلے وزیر اعظم بنے۔ انھوں نے چین کے علاوہ فرانس، انگلینڈ، جرمنی اور جاپان میں تعلیم حاصل کی۔ چین کے سابق وزیر دفاع مسٹر لن پیاؤ آخری برسوں میں ان کے طاقت ور حریف کی حیثیت سے ابھرے۔ مگر ۱۹۷۲ میں وہ ان کو باغی قرار دے کر میدان سے ہٹانے میں کامیاب ہوگئے اور چین کے نمبر ۲ شخص بن گئے۔ تاہم وہ کینسر کے مرض سے اپنے کو نہ بچا سکے اور ۱۸ ماہ اسپتال میں رہ کر ۹ جنوری کو اس دنیا سے چلے گئے۔ چاؤ صرف ایک بچے کے والد بن سکے تھے جس کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا۔

سب مضحکہ خیز نظر آئیں گے

ماوزی تنگ (۱۹۷۶-۱۸۹۳) تقریباً ۳۰ سال تک ۸۰۰ ملین آبادی کے ایک عظیم ملک کے مختار کل رہنے کے بعد بالآخر اس دنیا سے چلے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں انھوں نے اڈگر اسنو (Edgar Snow) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

A thousand years from now, all of us - even Marx, Engels and Lenin will look rather ridiculous

اب سے ہزار سال بعد ہم لوگ، حتی کہ مارکس انجلس اور لینن سب مضحکہ خیز دکھائی دیں گے۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

گئے تھے۔ اب ان کا پوتا پرنس جوان کارلو ڈی بوربون دوبارہ اسپین کا حکمراں ہے جس کو جنرل فرانکو نے اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا

عام اسپینی مزاج کے برعکس جنرل فرینکو میں دو نمایاں خصوصیتیں پائی جاتی تھیں احتیاط اور نرمی۔ فرینکو نے ایک بار سمندر میں مچھلی کا شکار کھیلنا چاہا۔ اس وقت سمندر میں طوفان تھا۔ انھیں مشورہ دیا گیا کہ وہ سمندر میں داخل نہ ہوں۔ مگر وہ مصر رہے۔ ان کی بیوی دونا کارمینا نے کہا "اگر آپ ان موجوں میں ڈوب گئے تو اسپین کا کیا ہوگا؟" فرینکو نے جواب دیا "خدا اسپین کی حفاظت کرے گا۔"

کھدائی ختم نہیں ہوئی

سر مورٹی مر وھیلر (۱۹۷۶ — ۱۸۸۹)

اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے۔ وہ آثار قدیمہ کے عالم تھے۔ انگلستان کے تین تاریخی مقامات (سٹنی، ویرلامیم، میڈن کیسل) کی کھدائی کے بعد ان کو کافی شہرت حاصل ہوئی اور وہ رومن آرکیالوجی کے ماہر سمجھے جانے لگے۔ ۱۹۴۴ء میں وہ غیر منقسم ہندوستان میں آرکیالوجیکل سروے کے ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے مختلف تاریخی مقامات کی کھدائی کی اور آثار قدیمہ سے متعلق دوسرے اہم کام انجام دیئے۔

ہندوستان میں جب ان کا تقرر ہوا تو یہاں کے پریس میں ان کو نااہل ثابت کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ: "وہ رومن آرکیالوجی کے ماہر ہیں، ہندوستان کے علم الآثار میں وہ ہمارے کیا مددگار بن سکتے ہیں؟" مگر اپنے اعلیٰ کام سے انھوں نے اتنی اہلیت ثابت کی کہ آزادی کے بعد بھی وہ ہمارے محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے بار بار ہندوستان بلائے جاتے رہے۔ حتیٰ کہ آزادی سے پہلے اپنی چار سالہ ملازمت کے دوران انھوں نے پانڈیچری کے پاس آریکامیڈو کی کھدائی کر کے یہ بھی ثابت کیا کہ رومن ہندوستان تک پہنچ گئے تھے۔

سر وھیلر نہایت محنتی اور ذمہ دار آدمی تھے۔ ان کا قول تھا:

Every excavation is destruction unless it is properly recorded.

کھدائی کا ہر کام برباد کرنے کا کام ہے۔ جب تک کہ اس کو صحیح طور پر ریکارڈ کرنے کا انتظام نہ کیا گیا ہو۔

سر وھیلر کو اپنی پوری زندگی "کھدائی" کی زندگی نظر آتی تھی۔ شاید انھیں یہ احساس تھا کہ وہ ابھی تک اصل حقیقت تک نہیں پہنچے ہیں۔ انھوں نے اپنے بعد اپنی خود نوشت سوانح عمری چھوڑی ہے اور اس کا نام معنی خیز طور پر اب بھی کھدائی کرتے ہوئے STILL DIGGING تجویز کیا ہے۔

کوئی وقت نہیں

کرشن بھاٹیا (م، — ۱۹۲۵) ان انتہائی چند ہندستانیوں میں تھے جنھوں نے ملکی صحافت میں تجزیاتی تحریر (analytical writing) کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ اپنی عمر کے آخری آٹھ سال انھوں نے واشنگٹن میں ہندستان ٹائمس کے کرسپانڈنٹ کی حیثیت سے گزارے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۴ کو جب ریڈیو نے بتایا کہ اچانک حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے واشنگٹن میں ان کا انتقال ہو گیا تو بہت سے لوگ اچنبھے میں پڑ گئے۔ کیونکہ موت کے وقت کرشن بھاٹیہ پوری طرح تندرست اور توانا تھے اور پختگی کے اس آخری کنارہ پر پہنچ چکے تھے جب کہ آدمی اپنی صلاحیتوں کو کامیاب ترین شکل میں استعمال کرنے

کے قابل ہوجاتا ہے۔

ڈاکٹر آنے سے پہلے

نرنجن سنگھ طالب (۷۶-۱۹۰۱) نئی دہلی میں اپنے مکان پر تھے۔ انھوں نے ایک پیالی چائے پی۔ اس کے بعد ہی انھیں سینہ میں درد محسوس ہوا۔ فوراً قریبی ڈسپنسری سے ایک ڈاکٹر بلایا گیا۔ ڈاکٹر ان کے مکان پر پہنچا تو اس کے لئے صرف یہ مقدر تھا کہ وہ مریض کو دیکھ کر یہ اعلان کرے کہ اس کا انتقال ہوچکا ہے۔

نرنجن سنگھ طالب پنجاب کانگرس کے صدر اور راجیہ سبھا کے ممبر تھے۔ اس سے پہلے وہ پنجاب کی کابینہ میں وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے نیتاجی سبھاش چندر بوس کے ہندستان سے بھاگ کر جرمنی پہنچنے میں مدد کی تھی۔ جس کے نتیجہ میں ان کے اوپر انگریزوں نے مقدمہ چلایا۔ ۱۹۴۳ میں وہ اپنے صوبہ پنجاب سے نکال دیئے گئے۔

نئی تاریکی

پچھلے ستمبر میں دو ہم عمر فن کاروں کے لئے موت کا پیغام آگیا۔ ایک، بنگال کے باغی شاعر قاضی نذرالاسلام (۱۸۹۹-۱۹۷۶) دوسرے مرہٹی کے سماجی ناول نگار وی ایس۔ کھنڈیکر (۱۹۷۶-۱۸۹۸)۔ دونوں کو غیر معمولی شہرت اور عزت ملی۔ مگر دونوں مسلسل بیماری اور حادثات کا شکار رہے۔ حتیٰ کہ دونوں اپنی آنکھ سے محروم ہوچکے تھے قاضی نذرالاسلام کی آنکھ ۱۹۴۲ میں فالج کے حملہ میں ختم ہوگئی۔ کھنڈیکر کی آنکھ عرصے سے نہایت کم زور ہوچکی تھی۔ موت سے تقریباً تین سال پہلے وہ بالکل ہی اندھے ہوگئے۔

کھنڈیکر سے آخر عمر میں ایک اخبار نویس نے سوال کیا کہ آنکھوں کے چلے جانے کے بعد آپ کیا محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا:

I have adjusted myself
to this new darkness.

میں نے اپنے آپ کو اس نئی تاریکی سے ہم آہنگ کرلیا ہے۔

مرداں چنیں کنند

لارڈ ٹامسن (۱۹۷۶ – ۱۸۹۴) کی پیدائش کناڈا میں ہوئی۔ انھوں نے اخبارات کو صنعت کی حیثیت سے شروع کیا اور اس میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ آج تک اخبارات کے کسی بھی دوسرے تاجر نے حاصل نہ کی تھی۔ کناڈا، برطانیہ، امریکہ اور دوسرے ملکوں کے ایک سو سے زیادہ اخبارات "ٹامسن ایمپائر" کا حصہ تھے۔

ٹامسن بے حد شریف آدمی تھا۔ اخلاقی حیثیت سے کبھی اس سے کسی کو شکایت نہیں ہوئی۔ ایڈیٹروں کے انتخاب میں وہ انتہائی چھان بین کرتا تھا۔ مگر جب کسی شخص کو کسی اخبار کا ایڈیٹر مقرر کر دیتا تو اس کو اپنے دائرہ عمل میں مکمل آزادی دے دیتا تھا۔ حتی کہ اس کے اڈیٹروں کو یہ حق بھی تھا کہ وہ خود ٹامسن کے خلاف مضامین لکھ سکیں۔

ٹامسن کی سوانح عمری رسل بریڈن نے لکھی ہے جس کا نام ہے:

Roy Thomson of Fleet Street

سوانح نگار لکھتا ہے کہ ٹامسن کی واحد کمزوری یہ تھی کہ وہ "لارڈ" بننے کا بہت زیادہ حریص تھا۔ اس نے دیکھا کہ اپنے ملک کناڈا میں اس کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ کناڈا نے لارڈ کا خطاب دینے کے برطانوی طریقے کو ختم کر دیا تھا۔ چنانچہ ٹامسن نے برطانوی شہریت اختیار کر لی۔

اسے یقین تھا کہ برطانیہ آنے کے بعد وہ ضرور لارڈ بننے کا خواب پورا کر سکے گا۔ مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ سامنے آگئی۔ ہیرولڈ میکملن کے بعد لارڈ ہوم برطانیہ کے وزیر اعظم (۶۴ – ۱۹۶۳) مقرر ہوئے۔ ٹامسن کے مشہور اخبار "ٹائمز" کے ایڈیٹر اس وقت ڈینس ہملٹن تھے۔ انھیں اس تقرر پر اعتراض تھا۔ انھوں نے خاموش رہنے کے بجائے کھلم کھلا نئے وزیر اعظم کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔

ٹامسن کے لئے یہ ایک انتہائی نازک صورت حال تھی۔ انھوں نے اپنے اڈیٹر کو گفتگو کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب وہ اپنی رائے بدلنے پر تیار نہ ہوا تو انھوں نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ یہ کہہ کر معاملہ کو ختم کر دیا:

What you say is your own province

یعنی یہ تمھارے اپنے دائرہ کار کا معاملہ ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ جو کچھ لکھنا چاہتے ہو لکھو۔

برطانوی شہریت اختیار کرنے کے باوجود ٹامسن کے لئے اب بظاہر "لارڈ" بننے کا امکان ختم ہو چکا تھا۔ ان کا اخبار برابر برطانوی وزیر اعظم پر تنقیدی مضامین شائع کر رہا تھا۔ مگر سر الیک ڈگلاس ہوم نے بھی عالی ظرفی سے کام لیا۔ صاحب اقتدار ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے دل میں ٹامسن کے خلاف کوئی انتقامی جذبہ پیدا ہونے نہیں دیا۔ اور ان کے لئے لارڈ کے اعزاز کی منظوری دے دی۔

یہی عالی ظرفی ہے جو افراد اور قوموں کو ترقی کے اعلیٰ مقام کی طرف لے جاتی ہے۔

شیخ محمد بدرالاسلام فضلی ایم۔ اے، بی ٹی (علیگ) ۴۵ سال پہلے جاپان گئے تھے۔ ہندستانی حکومت نے ان کا تقرر ٹوکیو کے اسکول آف فارن لینگویجز میں اردو اور فارسی لکچرر کی حیثیت سے کیا تھا۔ وہ دسمبر ۱۹۲۲ میں سمندری جہاز سے جاپان پہنچے اور اپریل ۱۹۳۲ تک وہاں مقیم رہے۔ جاپان کے حالات اور اپنے سفر کی روداد پر اس وقت انھوں نے چار سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب (حقیقت جاپان) لکھی تھی جو ۱۹۳۴ میں انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد دکن) نے شائع کی تھی۔ مطبع کا نام کتاب پر "جامع برقی پریس دہلی" لکھا ہوا ہے۔

یہاں اس کتاب کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

"۹ ستمبر ۱۹۳۱ کو ایک ہندستانی مسلمان تاجر مسٹر احمد ٹوکیو آئے تھے۔ مجھ سے ملنے کے لئے مکان پر تشریف لائے۔ ان کے والد ناسک کے رہنے والے تھے اور ان کی والدہ ایک چینی خاتون تھیں۔ یہ ہانگ کانگ میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم پائی۔ ہندستان کبھی نہیں گئے بائیس سال سے جاپان میں ہیں۔ یہیں ایک جاپانی خاتون سے شادی کر لی ہے۔ اب سن لائف انشورنس کمپنی کے ایجنٹ ہیں۔ مسٹر احمد انگریزی، اردو اور جاپانی زبانوں میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ کوبے (جاپان) میں ہندستانی مسلمانوں کی تعداد ساٹھ اور روسی مسلمانوں کی تعداد سو سے زائد ہے۔ کوبے کے مسلمان اب تک جمعہ اور عیدین کی نمازیں ہندستانی کلب کی عمارت میں ادا کرتے ہیں مگر تقریباً دو سال سے یہ تحریک جاری ہے کہ ایک مسجد تعمیر کی جائے۔ ستر ہزار ین تخمینہ ہوا ہے مگر اب تک اس کام کے لئے چندہ سے تیرہ ہزار ین جمع ہوئے"

ہیں۔ یہ رقم بھی آل ہندستانی مسلمان تاجروں نے دی ہے جو کوبے میں اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ ہندستان میں بھی چندے کی تحریک کی گئی ہے مگر ہنوز کچھ وصول نہیں ہوا۔ چندہ وصول کرنے اور مسجد تعمیر کرانے کے لئے ایک انجمن قائم ہے۔ مسٹر احمد اس انجمن کے سکریٹری ہیں۔ چنانچہ احمد صاحب توکیو اسی غرض سے آئے تھے اور اراکین سلطنت سے ملنے کے لئے ایک روسی مسلمان کا خط قربان علی آفندی کے نام لائے تھے، جو توکیو میں روسی مسلمانوں کے امام ہیں اور نہایت حکام رس اور ذی اثر آدمی ہیں۔

۱۰ ستمبر کو مسٹر عبدالغنی، مسٹر احمد اور میں قربان علی آفندی سے ملنے کے لئے گئے۔ متوسط العمر، فربہ اندام اور وجیہہ آدمی ہیں۔ بڑے تپاک وخلوص سے ملے۔ گیارہ برس سے جاپان میں مقیم ہیں، جاپانی زبان خوب بولتے ہیں، مگر انگریزی زبان نہیں جانتے۔ ان سے معلوم ہوا کہ توکیو میں روسی مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد ہے۔ یہ لوگ نسلاً تاتاری ہیں، مگر روسی سلطنت کے باشندے ہیں۔ حکومت سوویت روس نے ان کو جلاوطن کر دیا ہے۔ جاپان میں یہ لوگ مزدوری پیشہ ہیں۔ جفاکشی اور دیانت سے روزی کماتے ہیں۔ ان سب کا قیام ایک ہی محلہ میں ہے۔ قربان علی آفندی کی مساعی جمیلہ سے ایک مسجد، ایک اسلامی مدرسہ اور ایک قبرستان بن گیا ہے۔

اخراجات کے لئے آپس میں چندہ کر لیتے ہیں۔ چندہ کی رقم اس قدر دیانت داری اور کفایت شعاری سے خرچ ہوتی ہے کہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ پس انداز ہوتا رہتا ہے۔ اس رقم سے ایک پریس بھی قائم کیا ہے اور ترکی زبان میں ایک سہ ماہی رسالہ بھی نکلتا ہے۔ قربان علی صاحب سے

انسائیکلوپیڈیا میں اسلام پر مقالہ لکھنے کے لئے ایک جاپانی فاضل نے اسلام کا مطالعہ کیا، وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا

دیر تک گفتگو رہی۔ اپنی انجمن کے حالات سناتے رہے۔ بعد ازاں اپنے ہمراہ لے جاکر مسجد و مدرسے کی سیر کرائی۔ یہیں ایک کمرے میں پریس ہے۔ یہاں قربان علی صاحب نے اپنے رسالہ "ژاپوں مجبری" کے کئی نمبر اور اپنے پریس کے چھپے ہوئے تصویری پوسٹ کارڈوں کا ایک سٹ علیحدہ علیحدہ ہم تینوں کو عنایت فرمایا۔

اگلے دن شام کو پھر ان کے مکان پر گئے، کھانے میں بڑا تکلف کیا تھا۔ انواع و اقسام کے ترکی اور جاپانی کھانے میز پر آئے۔ ترکی کھانے نہایت لذیذ تھے، اور ہندستانی اور ایرانی کھانوں سے بہت زیادہ ملتے جلتے تھے۔ دوران گفتگو میں آفندی نے ہمیں بتایا کہ تاتاری لوگ گوشت، شہد اور چائے بہت استعمال کرتے ہیں۔

وزیر اعظم جاپان کے پرائیویٹ سکریٹری بھی شریک طعام تھے اور ان کو خاص مصلحت سے اس وقت مدعو کیا گیا تھا۔ تعارف تو کھانے سے قبل ہو چکا تھا۔ مگر کھانے کے بعد مطلب کی گفتگو ہوئی۔ آفندی نے سکریٹری صاحب کے سامنے مسٹر احمد کے آنے کی غرض اور کوبے کی مجوزہ مسجد کی تعمیر کا ذکر کیا۔ اور یہ درخواست کی کہ ہم لوگ وزیر اعظم سے اس غرض کے لئے ملنا چاہتے ہیں کہ حکومت بھی اس کام میں کچھ امداد فرمائے، آپ ملاقات کا انتظام کر دیجئے۔ اور خود بھی وزیر صاحب موصوف سے سفارش کر دیجئے۔ انھوں نے دونوں باتوں کا وعدہ کیا

جمعہ کے روز نماز کے لئے مسجد گیا۔ پچاس نمازی جمع ہوئے۔ ہر شخص ہیٹ کے نیچے ایک گول مخمل کی ٹوپی پہن کر آیا تھا۔ نیچے کی منزل میں اور زینے پر بہت سی کھونٹیاں دیوار پر لگی ہوئی ہیں۔ ہیٹ اُن پر ٹانگ دی، اور گول ٹوپی پہن کر اوپر کے ہال میں جہاں نماز ہوتی ہے جمع ہوئے۔ بعض لوگوں نے نیچے کی منزل میں وضو بھی کیا۔ نماز کے بعد تمام نمازیوں سے مصافحہ ہوا۔ یہیں ایک جاپانی صاحب سے بھی تعارف ہوا۔ یہ بھی نماز میں شریک تھے۔ ایک روسی مسلمان مسٹر صابر جمیل نے مجھ کو اور جاپانی مسلمان صاحب کو جن کا نام مسٹر سیورد تھا اسی وقت چائے نوشی کی دعوت دی۔ صابر صاحب مسجد کے قریب ہی ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان میں رہتے ہیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ عائشہ نے مہمانوں کی بڑی خاطر مدارات کی۔

مسٹر سیورد سے اسلام کے متعلق گفتگو ہوئی۔ میں نے دریافت کیا کہ اسلام کی کس خوبی نے آپ کو اس طرف مائل کیا۔ انھوں نے بیان کیا کہ ان سے جاپانی انسائیکلوپیڈیا میں اسلام کے متعلق آرٹیکل لکھنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ مطالعہ اور تحقیق کے بعد خود بخود اسلام کی حقانیت ان پر روشن ہو گئی۔ اور بغیر کسی خارجی تحریک کے مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

انھوں نے کہا کہ اسلام کی بے شمار خوبیاں ہیں۔ مگر دو خوبیوں نے خصوصاً ان پر بڑا اثر کیا، اول توحید اور ثانیاً مذہبی رواداری۔ مسٹر سیورد توکیو میں تنہا جاپانی مسلمان ہیں۔ ان کے علاوہ تمام جاپان میں معدودے چند جاپانی مسلمان ہیں۔" سیاحت جاپان ۱۴۱۔۱۱۱

یہ کام نہیں، کام کے مواقع کو برباد کرنا ہے

موجودہ دور کے مسلم مصلحین سے ایک بڑی اجتہادی غلطی یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے سمجھا کہ جن ملکوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور جہاں ان کا سیاسی اقتدار قائم ہے، وہاں وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ "قانونِ اسلامی کے نفاذ" کے مطالبہ سے اپنی مہم کا آغاز کرسکیں یہ ایک اندوہناک قسم کا غلط اندازہ تھا جس سے عملاً اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا کہ وہ اپنے ملکوں میں حزب مخالف کا پارٹ ادا کر کے ختم ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم اقلیت کے ملکوں میں جو مسئلہ مقامی غیر مسلم اکثریت کی طرف سے ہے، وہی مسلم اکثریت کے ممالک میں عالمی حالات کی جانب سے ہے۔ مزید یہ کہ مسلم ملکوں کے تمام حکومتی شعبوں پر چونکہ وہی لوگ قابض ہیں جن کی تعلیم مغربی طرز کے اداروں میں ہوئی ہے کیونکہ وہی جدید دور کی ایک ریاست چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس لئے مسلم ملکوں کا برسرِ اقتدار طبقہ بھی، اسلام سے طبعی ہمدردی رکھنے کے باوجود، مزاجاً اس حد تک جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنے یہاں خالص مذہبی ریاست کے قیام کا اعلان کر دے۔ مصر، پاکستان، انڈونیشیا وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ ان ملکوں میں موجودہ صدی کے وسط میں جو اسلامی تحریکیں اٹھیں، وہ اپنی ساری مقبولیت اور ترقی کے باوجود، اسلامی قانون کے نفاذ میں تو کامیاب نہیں ہوئیں، البتہ مسلم ملک ہونے کی وجہ سے وہاں ان کو اسلامی دعوت کے کام کو مؤثر طور پر چلانے کے لئے جو خصوصی مواقع حاصل تھے وہ بھی اختلافی اور احتجاجی سیاست کے نتیجہ میں برباد ہو گئے۔ قاضی ابو یوسف (۹۸،) اور شیخ احمد سرہندی (۱۶۲۵ — ۱۵۶۴) نے بالترتیب عباسی خلیفہ ہارون الرشید اور مغل شہنشاہ جہاں گیر سے مل کر جو اسلامی خدمات انجام دیں، اگر موجودہ زمانہ کے مصلحین نے بھی اس ڈھنگ پر کام کیا ہوتا تو اب تک اظہارِ دین اور غلبۂ اسلام کا وہ کام انجام پا چکا ہوتا جس کے لئے ابھی ہم صرف غور و فکر کر رہے ہیں۔

لطیفہ

ابن الرومی (۲۸۴ — ۲۲۱ھ) ایک شاعر تھا وہ لوگوں کی ہجو کیا کرتا تھا۔ خلیفہ معتضد باللہ کے وزیر ابو الحسین قاسم بن عبد اللہ کو ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ وہ اس کی ہجو کر کے اس کو عوام میں ذلیل نہ کرے۔ یہ وزیر بڑا بے رحم تھا۔ اس نے اس مسئلہ کا حل یہ سوچا کہ اس کے وجود ہی کو ختم کر دیا جائے۔ ایک بار جب ابن الرومی وزیر کے دسترخوان پر کھانا کھا رہا تھا وزیر نے چپکے سے اس کے کھانے میں زہر ڈال دیا۔ ابن الرومی زہر آلود کھانے کے کچھ لقمے کھا چکا تو اس کو احساس ہوا۔ وہ فوراً کھانے سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد دونوں میں جو گفتگو ہوئی وہ یہ ہے۔

وزیر: ابن الرومی! کہاں جا رہے ہو۔

ابن الرومی: جہاں تم مجھ کو بھیجنا چاہتے ہو۔

وزیر: دیکھو وہاں پہنچ کر میرے والد کو میرا سلام پہنچا دینا۔

ابن الرومی: لیکن جہنم سے میرا گزر نہیں ہوگا۔

جدید مسئلہ کیا ہے ؟

انسانی تاریخ کو دو بڑے دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ـــــ دور سائنس سے پہلے اور دورِ سائنس کے بعد۔ وہ چیز جس کو "دورِ جدید" کہتے ہیں، وہ حقیقۃً دورِ سائنس کا دوسرا نام ہے۔ یہ دور ممتاز طور پر سترھویں صدی میں شروع ہوا اور دوسری جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹) تک اپنے آخری عروج پر پہنچ گیا۔

انسان خارجی طور پر جو عمل کرتا ہے، اس کے لئے اس کے پاس دو قدرتی ذریعے ہیں: حواس اور طاقت۔ حواس کے ذریعے وہ اشیاء کا علم حاصل کرتا ہے، اور طاقت کے ذریعے اپنے ارادہ کو ان کے اوپر نافذ کر کے ان کو اپنے لئے کار آمد بناتا ہے۔ یہ دونوں عمل قدیم ترین زمانے سے جاری ہیں۔ پچھلے زمانہ میں اشیاء کو جاننے کے لئے اس کے پاس صرف وہ قدرتی عطیات تھے جن کو حواس خمسہ کہا جاتا ہے اور خارجی دنیا میں تصرف کرنے کے لئے اس کے پاس اپنے ہاتھ پاؤں تھے یا حیوانی طاقت، مثلاً اونٹ، گھوڑے، ہاتھی، بیل وغیرہ۔ تاہم ان ابتدائی قدرتی عطیات کے علاوہ زمین میں بے شمار ایسی چیزیں تھیں جو اس بات کو ممکن بناتی تھیں کہ ان کو حاصل کر کے آدمی اپنے حواس اور طاقت دونوں کی مقدار کو بڑھا سکے۔

اضافہ کا یہ عمل نامعلوم زمانہ سے جاری تھا۔ مردہ تہذیبوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دوروں میں بھی انسان اس میدان میں بڑی بڑی ترقیات حاصل کرتا رہا ہے۔ تاہم ماضی کی تمام ترقیاں ابتدائی فطری حدود کے اندر ہوتی تھیں۔ مثلاً پتھر کی جگہ لوہے کو کام میں لانا یا پہیہ دار گاڑی بنا کر جانوروں کو سواری کے لئے استعمال کرنا۔ موجودہ دور کو یہ اولیت حاصل ہے کہ اس نے معلوم تاریخ میں پہلی بار طاقت کو "مشین" کی حیثیت دے دی اور فطری حواس کے لئے ایسے میکانکی اور آلاتی معاون دریافت کر لئے جو ہمارے دیکھنے اور تجربہ کرنے کی صلاحیت کو لاکھوں کروڑوں گنا زیادہ بڑھا سکتے تھے۔

اس دریافت کا براہ راست فائدہ تو صرف یہ تھا کہ انسانی تمدن کے لئے مادی ترقی کا ایک نیا وسیع تر دروازہ کھل گیا۔ انسان کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنے سفر کی رفتار کو بے اندازہ مقداروں میں بڑھا سکے۔ زمین کے جن وسائل تک روایتی ذرائع سے اس کی دسترس نہیں ہو سکتی تھی، ان کو حاصل کر کے اپنی بستیوں کو ناقابل قیاس حد تک زین کرے۔ تخریب و تعمیر کے لئے، مقدار اور نوعیت دونوں اعتبار سے، اتنے زیادہ سامان فراہم کرے جس کا خواب بھی پچھلے انسانوں نے نہیں دیکھا تھا۔

تاہم انسانی تاریخ کا اتنا بڑا واقعہ بالواسطہ اثرات پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے انسانی افکار پر بھی اپنے اثرات ڈالنے شروع کئے یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر تک یہ عالم ہو گیا کہ سارے علوم انسانی اس سے متاثر ہو کر رہ گئے۔ مذہب، اخلاق، فلسفہ، قانون، معاشیات، سیاسیات، غرض

کوئی ذہنی موضوع ایسا نہ تھا جس نے گہرے طور پر اس سے اثر قبول نہ کیا ہو۔ فطری طور پر یہ اثر یک طرفہ تھا۔ فکری علوم سائنس کے اوپر اپنی چھاپ نہ ڈال سکے، وہ صرف سائنس کے عمومی غلبہ کا شکار ہو کر رہ گئے۔

سائنس اپنی ابتدائی شکل میں فکری علوم کی موافق تھی نہ مخالف۔ انسان اگر نظام شمسی کی حرکت کا نقشہ معلوم کر لے، یا آٹومیٹک مشین کے ذریعے کام لینے لگے تو اس میں اخلاق یا انسانی اقدار سے ٹکراؤ کا پہلو کیا ہے۔ تاہم سائنس کے ظہور کے ساتھ چند باتیں ایسی پیش آئیں جنھوں نے سائنس کو فکری علوم، خاص طور پر مذہب و اخلاق سے، متصادم کر دیا۔

۱۔ مذہب کے ماننے والوں نے سائنس کے ظہور سے پہلے روایتی معلومات کے تحت اپنا ایک فکری نظام بنا رکھا تھا۔ سائنس کی دریافتیں سامنے آئیں تو معلوم ہوا کہ ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو سائنس کی معلوم کردہ دنیا سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اب چونکہ سائنس زیادہ ترقی یافتہ ذرائع معلومات کے حوالے سے کلام کر رہی تھی، قدرتی طور پر سمجھا گیا کہ وہی بات صحیح ہے جو سائنس کی طرف سے آئی ہے۔ اس واقعہ نے مذہب کو لوگوں کی نظر میں بے اعتبار بنا دیا۔ اس میں مزید شدت اس واقعہ سے پیدا ہوئی کہ اہلِ مذہب، خصوصاً عیسائی حضرات نے، اپنے روایتی عقائد کے تحفظ کے لئے سائنس کے خلاف نہایت سخت رویہ اختیار کیا۔ ان کے اس ردعمل نے لوگوں میں یہ تاثر پیدا کیا کہ مذہب اور سائنس کا ٹکراؤ حقیقی ہے، اور جب دلائل کی منطق صریح طور پر سائنس کی طرف ہے تو یقیناً مذہب ایک بے اصل چیز ہے۔ اس کی حقیقت توہم پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔

۲۔ دوسری غلطی سائنس دانوں یا کم از کم سائنس کے حوالے سے بولنے والوں نے کی۔ عالم طبیعیات میں اپنی فتوحات سے وہ اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ وہ اس حیثیت میں ہیں کہ وسیع تر فلسفیانہ مسائل کے بارے میں رائے زنی کر سکیں۔ حالاں کہ، جیسا کہ بعد کو خود سائنس کی مزید دریافتوں سے معلوم ہوا، عالم طبیعی کے بارے میں ان کے مشاہدات، فلسفہ یا عالم افکار کے نازک مسائل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے لئے انتہائی ناکافی تھے۔

یہاں ہم اپنے مدعا کی وضاحت کے لئے دونوں قسموں کی ایک ایک مثال بیان کریں گے۔

زمین اور سورج کی گردش کے بارے میں قدیم یونان میں دو نظریے پیش کئے گئے تھے۔ ایک ارسطو کا نظریہ، جس کا مطلب یہ تھا کہ زمین قائم ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ دوسرا ارسٹارکس (Aristarchus) کا نظریہ جس کے مطابق زمین سورج کے گرد گھوم رہی تھی۔

عیسائیوں کے درمیان ارسطو کا نظریہ بہت مقبول ہوا کیونکہ مرکزیت زمین کے نظریہ (Geocentric Theory) میں زمین کو بنیادی اہمیت حاصل ہو رہی تھی اور چونکہ انھوں نے حضرت مسیح کو خدائی کا مقام دے رکھا تھا۔ اس لئے ان کا خیال یہ ہو گیا کہ وہی کرہ نظام شمسی کا مرکز بن سکتا ہے جہاں خداوند مسیح پیدا ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ مرکزیت زمین کے نظریہ کو انھوں نے اپنے علم کلام میں داخل کر لیا۔ کوپرنیکس (۱۴۷۳-۱۵۴۳) نے جب مرکزیت آفتاب کا نظریہ (Heliocentric Theory) پیش کیا تو یورپ میں عیسائی پیشواؤں کو اقتدار حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے

عقیدہ کے تحفظ کے لئے کوپرنیکس کے خلاف عدالتی سزا کا حکم جاری کر دیا۔ خداوند کی جنم بھومی کو تابع (Satellite) قرار دینا ایک ایسا جرم تھا جو کسی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مگر یہ مسئلہ روایتی عیسائیت کا تھا نہ کہ حقیقی معنوں میں خدائی مذہب کا۔ چنانچہ مسلمان جو اس اعتقادی پیچیدگی میں مبتلا نہ تھے کہ پیغمبر کو خدا سمجھتے تھیں، انھوں نے مرکزیتِ آفتاب کے نظریہ کو زیادہ معقول پا کر اسے قبول کر لیا۔ ان کے یہاں یہ سوال نہیں اٹھا کہ شمسی مرکزیت کا نظریہ مذہبی تعلیمات سے ٹکراتا ہے:

"ارسطو کے احترام کے باوجود عرب کائنات کے بارے میں ارسطو کے نظریہ پر تنقید کرنے میں نہیں ہچکچائے، جس کا مطلب یہ تھا کہ زمین آسمانی اجرام کا مرکز ہے اور تمام اجرام اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس کے برعکس عربوں نے اس امکان کو تسلیم کیا کہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہوئی سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔"

Edwara McNall Bunrs
Western Civilization, P.264

سائنس دانوں کی غلطی کی ایک مثال اصول تعلیل (Causation) میں ملتی ہے۔ اشیاء کے مشاہدہ سے جب یہ حقیقت ان کے سامنے آئی کہ واقعات کے پیچھے ایک سبب کارفرما ہوتا ہے، مثال کے طور پر اجرام سماوی کی گردش کے پیچھے جذب وکشش کا قانون یا قوس قزح کے پیچھے بارش کے قطرات سے سورج کی شعاعوں کا گزرنا، تو انھوں نے سمجھ لیا کہ ان کو اس سوال کا جواب مل گیا ہے جس کے لئے فلسفہ ہزاروں سال سے "علت کائنات" کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ حالاں کہ علت کائنات کا مسئلہ نہایت گہرے سوالات سے جڑا ہوا تھا اور سائنس دانوں کا طبیعی مشاہدہ کسی بھی درجہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس کو اس نازک اور گہرے سوال کے جواب کے لئے استعمال کیا جائے۔ تاہم انھوں نے استعمال کیا۔ حتیٰ کہ اس کو خالق کے انکار کا سب سے بڑا ثبوت سمجھ لیا۔ مگر بیسویں صدی کے آغاز میں خود سائنس نے ایسے حقائق دریافت کئے جس کے بعد الحاد کی یہ بنیاد ہمیشہ کے لئے منہدم ہوگئی۔

یہ ہے مختصر طور پر وہ فکری پس منظر جس میں جدید تاریخ کا وہ واقعہ وجود میں آیا جس کو مذہب اور سائنس کا تصادم کہا جاتا ہے۔

سائنس نے جدید دور کے ہر پہلو پر اتنی شدت اور وسعت کے ساتھ اثر ڈالا کہ علم کے تمام شعبوں اور فکر کے تمام گوشوں پر اس کی چھاپ پڑ گئی۔ جس قدیم روایتی ڈھانچہ میں لوگوں نے اسلام کو پایا تھا، وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور نیا فکری ڈھانچہ جو سائنس کے زیر اثر بنا، اس کے تحت اسلامی افکار کی تشکیل تو نہ کی جا سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نسل کی نسل تذبذب اور انتشار ذہنی کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس دور میں ایسے لوگ معدوم ہو گئے جو اسلام کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔ بلاشبہ ایسے لوگ تھے اور کروروں کی تعداد میں تھے۔ مگر انھوں نے اسلام کو روایتی سطح پر پایا تھا، شعور کی سطح پر نہیں پایا تھا۔ اس کمی کا نتیجہ صرف یہ نہیں ہوا کہ لوگ ایمان کی اس اعلیٰ فکری سطح کو نہ پہنچ سکے جہاں آدمی گرد و پیش کے تمام واقعات کو اس طرح اپنے شعور حق کا جزء بنا لیتا ہے کہ ہر طرف اس کو خدا کا جلوہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ بڑا اجتماعی نقصان یہ ہوا کہ اس دور میں مسلمانوں کے جو مذہبی

رہنما اٹھے، وہ خود بھی چونکہ ایسے تھے جنھوں نے فکرِ حاضر میں اپنے دین کو نہیں پایا تھا، بلکہ ماضی کے روایتی ڈھانچہ میں پایا تھا۔ اس لئے وہ دورِ جدید کے مطابق اسلامی مہم کی منصوبہ بندی نہ کر سکے۔ انتہائی اخلاص مگر انتہائی نادانی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو ایسی راہوں میں دوڑاتے رہے جن کی ساری قیمت ماضی کے نقشہ میں تھی، عہدِ حاضر کے نقشہ میں وہ اپنی قیمت کھو چکے تھے۔ وہ تاریخِ ماضی میں حال کا ڈراما کھیلتے رہے۔ اس کا نتیجہ صرف ایک دردناک شکست تھا۔ چنانچہ ہر محاذ پر شکست ہوئی اور شکست نے بالآخر مایوسی اور جھنجلاہٹ اور بے حوصلگی کا شدید تر تحفہ دے کر پوری قوم کی قوم کو موت کے کنارے پہنچا دیا۔

شعوری سطح پر دین کو پانے کا مطلب وقت کے افکار کے مقابلے میں دین کو پانا ہے۔ معرکہ بدر (۶۲۴ء) کے مجاہدین نے اَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ (انفال - ۶۰) کی تفسیر "تلوار" میں پائی تھی۔ مگر شاملی (۱۸۵۷) کے مسلمان بھی اگر آیت کی تفسیر یہی پائیں تو کہا جائے گا کہ انھوں نے قرآن کو عہدِ حاضر کی نسبت سے نہیں پایا۔ آج اس آیت کی تفسیر کو تلوار کی شکل میں پانا' قرآن کو گزرے ہوئے ماضی کے نقشہ میں پانا ہے۔ جب کہ تجدید کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو وقت کے نقشہ میں پایا جائے۔ خیالات کے اظہار کے لئے شعر و خطابت کی زبان استعمال کرنا' احیائے اسلام کی تحریکوں کا سیاسی رخ اختیار کرنا' وعظ خوانی اور فتوے کو اصلاحِ امت کے لئے کافی سمجھنا' سب اسی کے مظاہر ہیں۔

دورِ جدید میں ہمارے جو مصلحین اٹھے انھوں نے اگر فکرِ حاضر میں اپنے اسلامی شعور کو پایا ہوتا تو وہ جانتے کہ آج کے وہ کون سے افکار و عوامل ہیں جو اجتماعیات میں فیصلہ کن بن گئے ہیں اور ان کے مقابلہ میں احیائے اسلام کی منصوبہ بندی کس طرح ہونی چاہئے۔ ان کے پاس صرف روایتی عقیدہ کا سرمایہ تھا۔ بس اسی کو لئے ہوئے وہ وقت کے سمندر میں کود پڑے بدلے ہوئے زمانے میں اس قسم کا جوشِ ایمان انھیں کہیں نہیں پہنچا سکتا تھا اور نہ اس نے کہیں پہنچایا۔

انیسویں صدی میں یہ بات پوری طرح نمایاں ہو چکی تھی کہ مذہب کا روایتی ڈھانچہ اس جدید ڈھانچہ میں اپنی جگہ نہیں پا رہا ہے جو سائنس کے زیرِ اثر بنا ہے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ گہرائی کے ساتھ صورتِ حال کا جائزہ لے کر نیا فکری ڈھانچہ تیار کیا جائے جس میں اسلام دوبارہ اپنی جگہ پا سکے۔ اگر بروقت یہ کام ہو جاتا تو سائنس یا دورِ جدید نہ صرف یہ کہ مذہب کے حریف نہ بنتے بلکہ اس کو تقویت دے کر اس کو نئی زندگی عطا کرنے والے بن جاتے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ عیسائیت نے سیاسی اقتدار سے محرومی کے بعد ماڈرنزم کی شکل میں سائنس سے سمجھوتہ کر لیا۔ مسلمان دینِ حق کے حامل ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں تھے کہ تاریخِ جدید کے اس اہم کردار کو ادا کر سکیں، جس طرح انھوں نے نویں صدی عیسوی میں بغداد اور قرطبہ میں وقت کی سائنس اور فلسفہ کے مقابلہ میں اسی قسم کے کردار کو ادا کیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے یہ وہ وقت تھا جب کہ مسلمان قومیں زوال کا شکار ہو چکی تھیں۔ ان کے اندر نہ حوصلہ تھا نہ فکری بلندی۔ مزید یہ کہ جدید اقتصادیات میں اپنی محرومی کی وجہ سے وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ اس قسم کے کسی مؤثر کام کی قیمت ادا کر سکیں۔ اپنی پس ماندگی کی وجہ سے مسلمان اس کا ثبوت بھی نہ دے سکے کہ وہ وقت کے اس مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں۔ کجا کہ ان سے یہ امید کی جائے کہ وہ گہرائی کے ساتھ اس کا جائزہ لیتے اور زندگی کے جدید نقشہ میں مذہب کو اس کا مقام عطا کرتے۔

موجودہ حالات نے ہمارے لئے جو مسائل پیدا کئے ہیں، وہ دو قسم کے ہیں: نظری اور عملی۔

پہلے جزء کے سلسلہ میں اہم ترین کام یہ ہے کہ اسلام کے عقائد و احکام کو جدید استدلالی انداز میں مرتب کیا جائے تاکہ وہ لوگوں کو "آج کی چیز" معلوم ہونے لگیں۔ نہ یہ کہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ وہ اس دور کی چیز ہیں جب کہ انسان قبائلی دور میں سانس لیتا تھا۔

جدید انداز سے مراد یہ ہے کہ اسلوب تحریر اور مواد استدلال دونوں اعتبار سے وہ جدید علمی معیار کے مطابق ہو۔ موجودہ زمانے میں اسلوب تحریر مکمل طور پر بدل گیا ہے۔ قدیم روایتی اسلوب میں خطیبانہ انداز غالب ہوتا تھا۔ اب سائنسی اور تجزیاتی انداز کو پسند کیا جاتا ہے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبارت کے درمیان اشعار نقل کر دینا، زور الفاظ کا مظاہرہ کرنا یا مسجع فقرے لکھنا، نفس مضمون کی قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ اب یہ ساری چیزیں معیوب قرار پا چکی ہیں۔ قدیم تصور ادب میں تیر و نشتر قسم کے جملے، مخاطب کے اوپر تیز تیز ریمارک، جذباتی قسم کی عبارتیں انتہائی پسندیدہ ہوتی تھیں۔ مگر اب یہ تمام چیزیں علمی وقار کے خلاف سمجھی جاتی ہیں۔ قدیم ذوق کے مطابق مبالغہ آمیز الفاظ، رنگین ترکیبیں اور استعارے اور تشبیہات ادب کا کمال سمجھے جاتے تھے۔ مگر اب کوئی تعلیم یافتہ آدمی اس قسم کے مضمون کو پڑھنا بھی پسند نہیں کرتا۔

یہی حال مواد کا ہے۔ پہلے زمانے میں یہ بات بھی کسی چیز کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھی کہ آدمی اپنے نقطۂ نظر کے حق میں ایک مثال پیش کر دے یا ایک حکایت بیان کر دے۔ مگر اب اس کو غیر معتبر سمجھا جاتا ہے کہ کوئی شخص اس قسم کی چیزوں سے اپنی بات ثابت کرنے لگے۔ پہلے زمانے میں کسی حوالے کے لئے اعدادی قطعیت یا واقعاتی تعین ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا، مگر جدید ذوق کے لئے وہ کلام بے معنی ہے جس میں تعیناتی زبان استعمال نہ کی گئی ہو۔ قدیم طریقے میں استدلال کی بنیاد تمام تر قیاسی منطق ہوا کرتی تھی۔ مگر اب قیاسی منطق بے قیمت ہو گئی ہے۔ اب تاریخی، مشاہداتی اور تجزیاتی انداز میں بات کو ثابت کرنے کا نام ثابت کرنا ہے۔ قدیم انداز میں آدمی مناظر اور مبلغ بن کر ایک وکیل کی طرح بالکل برہنہ انداز میں اپنے نقطۂ نظر کی طرف سے بولتا تھا۔ اب غیر شخصی جائزے کو معیاری انداز سمجھا جاتا ہے۔

پچھلے سو برس میں ہمارے یہاں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بہت سی کتابیں بجائے خود قیمتی بھی ہیں۔ مگر دور جدید کے اعتبار سے ان کی افادیت محض جزوی ہے۔ کیونکہ وہ بیشتر خطیبانہ نثر کا نمونہ ہیں۔ سائنسی طرز استدلال پر تحریری کام ابھی تک ہمارے یہاں تقریباً صفر کے درجے میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان اسلام کو سمجھنے کے لئے بھی مستشرقین کی کتابیں پڑھتے ہیں جو، خواہ ہمارے نزدیک غلط ہوں، تاہم وہ اپنے انداز اور اسلوب کے اعتبار سے جدید معیار کی حامل ہوتی ہیں۔ مسلم مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں ان کو اپیل نہیں کرتیں۔

عملی مسائل کی فہرست، جن کے حل کے لئے وقت کے نظام اجتماعی میں تغیر ضروری ہے، بہت طویل ہے۔ وقت کا اجتماعی نظام، قومی اور بین اقوامی دونوں اعتبار سے، سراسر غیر خدائی بنیاد پر قائم ہے۔ اس کے ڈھانچے میں رہتے

ہوئے دین کے اجتماعی قوانین پر عمل کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ مگر یہاں اسلام نے جو راہ عمل تجویز کی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو ایک انقلاب پسند لیڈر عام طور پر اختیار کرتا ہے۔

اس کا حل موجودہ زمانے کی اسلامی جماعتوں نے یہ نکالا ہے کہ نظام حاضر سے ٹکرا جائیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ اجتماعی ایمان اگر ہمیں حاصل نہیں تو اس کے حصول کی خاطر موت تو ہمارے بس میں ہے۔ پھر کیوں نہ ہم "بے ایمان" زندگی کے مقابلہ میں "ایمان دار" موت کو ترجیح دیں۔

یہ خطرناک غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ اس دور میں اٹھنے والے مصلحین امت اس نکتہ کو نہ سمجھ سکے کہ اجتماعی اسلام کے لئے جدوجہد کا مقام آغاز اجتماعی اسلام نہیں، دعوت ہے۔ ہمارے کام کا آغاز اسلامی نظام کے قیام کے لئے براہ راست اقدام سے نہیں ہوگا بلکہ اساسات اسلام کی طرف دعوت سے ہوگا۔ مکہ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلامی جدوجہد کا حکم دیا گیا تو یہ نہیں کہا گیا کہ مکہ کی پارلیمنٹ (دارالندوہ) میں نمائندگی حاصل کرنے کا مطالبہ کردیا کعبہ کی تولیت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرو۔ بلکہ توحید اور مواساۃ بنی آدم سے متعلق سادہ تعلیمات بھیجی گئیں اور حکم ہوا کہ لوگوں میں ان کی تبلیغ کرو۔ اس سے آگے کی چیزیں، جن کے حصول کے لئے اجتماعی انقلاب ضروری ہے، ان کے بارے میں حکم دیا گیا کہ انھیں چھیڑنے کے بجائے ان کو برداشت کرو اور اس وقت کا انتظار کرو جب اللہ حالات میں ایسا تغیر فرمائے جب کہ بقیہ مسائل کے حل کی راہ نکل سکے۔ (یونس۔ آخر) اس معاملہ میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ ممکن دائرہ میں دین پر عمل کرتے ہوئے دعوتی جدوجہد شروع کردو، اور بقیہ تمام امور کو متوقع نصرت الٰہی کے خانہ میں ڈال دو۔ یہی مطلب ہے حکم دعوت کے بعد یہ کہنے کا کہ وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ (مدثر) اساسات دین کی طرف پرامن دعوت اور غیر اسلامی تسلط کی وجہ سے جو مشکلات و مسائل پیش آئیں، ان پر صبر، یہی تمام انبیاء کا طریقہ رہا ہے اور یہی آج بھی ان لوگوں کا طریقہ ہونا چاہئے جو مخالف ماحول میں اسلام کے احیاء کے لئے اٹھیں۔

اس کا محرک دنیاداری ہے نہ کہ دین داری

"مولوی صاحب" ایک صاحب نے تیز و تند لہجے میں کہا "آپ لوگ اپنی دینی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئے ہیں۔"

"کیوں"

"آپ لوگ اب تک عوام کو یہ نہ بتا سکے کہ نس بندی جائز ہے یا ناجائز۔ کوئی مولوی کہتا ہے جائز ہے، کوئی کہتا ہے ناجائز ہے۔"

آج کل اکثر اس قسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو زندگی کے معاملات میں جائز اور ناجائز جاننے کی بہت زیادہ فکر ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس معاملہ میں انھیں اسلام کا ٹھیک ٹھیک حکم معلوم ہو جائے تاکہ اس پر وہ صدق دل کے ساتھ عمل شروع کر دیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ اس سے پہلے بے شمار امور میں علماء نے متفقہ طور پر صاف صاف فتوے دیئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ صاحب نصاب کے لئے اپنے مال سے ہر سال زکوٰۃ نکالنا فرض ہے۔ اگر ایک شخص صاحب نصاب ہوتے ہوئے زکوٰۃ نہیں نکالتا تو اس کا سارا مال اس کے لئے حرام ہے تاوقتیکہ وہ اس کی باقاعدہ زکوٰۃ نہ نکالے۔ کیا اس مسئلہ کو بیان کرنے کے بعد سارے مسلمان اپنے اموال سے باقاعدہ زکوٰۃ نکالنے لگے۔

علماء نے بار بار شریعت کا یہ حکم مسلمانوں کو بتایا ہے کہ ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی جان، مال اور آبرو حرام ہے۔ کیا اس کے بعد ایسا ہوا کہ ہر مسلمان اپنے دوسرے بھائی کی ان چیزوں کو خنزیر کی طرح حرام سمجھ کر اس سے بچنے لگا۔ علماء نے کتنی ہی بار اپنی تقریروں اور تحریروں میں بتایا ہے کہ "استمداد" صرف اللہ کے لئے

قناعت

شفیق احمد انبالہ والے، دہلی

کہا جاتا ہے کہ مالک دینارؒ، رابعہ بصریؒ کی خدمت میں آئے۔ دیکھا کہ وہ ٹوٹے ہوئے لوٹے سے وضو کر رہی ہیں، پرانی چٹائی کا بستر ہے اور تکیہ کی جگہ اینٹ رکھی ہوئی ہے۔ افسوس کے ساتھ بولے:

"اے رابعہ! میری ملاقات دولت مندوں سے ہے۔ اگر اجازت ہو تو ان سے کہہ دوں۔"

رابعہ بصریؒ نے جواب دیا: "کیا ایک ہی خدا سب کو روزی نہیں دیتا۔ کیا وہ درویشوں کو روزی دینا بھول گیا ہے اور دولت مندوں ہی کی روزی یاد رکھتا ہے۔"

مالک دینارؒ نے کہا: "نہیں"

رابعہ بصری نے جواب دیا: "پھر اس کو یاد دلانے کی کیا ضرورت ہے۔"

ہے۔ غیر اللہ کو پکارنا یا اس سے مدد چاہنا مطلق حرام ہے۔
کیا اس کے بعد سارے مسلمان غیر اللہ سے استعانت چھوڑ کر صرف اللہ سے امیدوار بن کر اس سے لپٹ گئے۔
اس طرح کی بے شمار مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ علماء کے کھلے کھلے فتاوی کے باوجود لوگوں نے شریعت کے حکم کی کوئی پروا نہیں کی اور ان کی زندگی کی گاڑی بدستور اپنی ڈگر پر چلتی رہی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ نس بندی کے معاملے میں لوگ اتنا زیادہ بے تاب ہیں کہ شریعت ان کی رہنمائی کرے۔
اس کی وجہ لوگوں کی دنیا پرستی ہے نہ کہ آخرت پسندی۔ دراصل لوگوں کی صاحب اولاد ہونے کی تڑپ نے انھیں اس معاملہ میں اتنا پرجوش بنا دیا ہے نہ کہ صاحب شریعت ہونے کی تڑپ نے۔ ایسے معاملات جن میں وہ خود اپنے دنیا پرستانہ ذہن کی وجہ سے پرشوق ہیں، ان میں وہ شریعت کو بھی اپنے ساتھ ایک تائیدی عنصر کی حیثیت سے شامل کر لینا چاہتے ہیں اور جن معاملات کو ان کا دنیا پرستانہ ذہن کوئی اہمیت نہیں دیتا، ان میں انھیں شریعت کا حکم جاننے کی بھی ضرورت نہیں۔
ایک مثال لیجئے، آزادی کے بعد حکومت نے فیصلہ کیا کہ سرکاری تعلیم گاہوں میں سیکولر تعلیم دی جائے گی۔ کسی خاص مذہب کی تعلیم و تربیت ممنوع ہوگی۔ یہ کتنا اہم مسئلہ تھا۔ مگر اس کے لئے مسلمانوں میں کوئی خاص بے چینی پیدا نہیں ہوئی۔ کیوں۔ اس لئے کہ اس فیصلہ سے ان کی دنیا پرستانہ زندگی پر کوئی براہ راست زد نہیں پڑتی تھی۔ جس چیز کے بگڑنے کا اندیشہ تھا وہ آخرت تھی نہ کہ دنیا۔ اور جب دنیا سلامت ہو تو کسی کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

آپس کا لڑائی جھگڑا

آسمان سے آئی ہوئی مدد کو

دوبارہ لوٹا دیتا ہے

اسلام میں اتحاد و اتفاق کو بے حد اہمیت دی گئی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ نازک پہلو یہ ہے کہ وہ مسلم گروہ خدا کی نصرت سے محروم ہو جاتا ہے جس کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگیں۔ حدیث میں ہے کہ لیلۃ القدر کے تعین کا علم صرف اس لئے اٹھا لیا گیا کہ مدینہ میں دو مسلمان باہم لڑ پڑے تھے:

عن عبادۃ بن الصامت قال خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیخبرنا بلیلۃ القدر فتلاحی رجلان من المسلمین فقال خرجت لاخبرکم بلیلۃ القدر فتلاحی فلان وفلان فرفعت

عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز نکلے کہ ہم کو شب قدر کے بارے میں بتا دیں کہ وہ کس روز ہے۔ اس وقت دو مسلمان آپس میں (ایک قرض کے بارے میں) لڑ پڑے۔ آپ نے فرمایا، میں اس لئے نکلا تھا کہ تم کو شب قدر کی خبر دے دوں۔ مگر فلاں اور فلاں آپس میں لڑ پڑے۔ پس اس کا علم اٹھا لیا گیا۔
ابن کثیر لکھتے ہیں "اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام لڑائی جھگڑوں کو کس قدر برا سمجھتا ہے، یہاں تک کہ اس کی وجہ سے بڑی بڑی برکتیں اٹھا لی جاتی ہیں"۔

تعمیر ملت

مصر کے سلطان صلاح الدین (۱۱۹۳ — ۱۱۳۷) اور ہندستان کے سلطان ٹیپو (۱۷۹۹ — ۱۷۵۱) دونوں جوش ایمان اور شجاعت اور جنگی اہلیت کے اعتبار سے یکساں حیثیت کے مالک تھے۔ دونوں کو "مغربی طاقت" سے مقابلہ پیش آیا۔ مگر اول الذکر فلسطین کا فاتح بنا جب کہ دوسرے کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ حریف سے شکست کھا کر شہید ہو جائے۔ اس فرق کے پیچھے کوئی طلسماتی راز نہیں، ایک سادہ سی حقیقت ہے: سلطان ٹیپو کو اٹھارویں صدی کا زمانہ ملا جب کہ جنگی صنعت میں مغرب نے اجارہ داری حاصل کر لی تھی۔ اس نے روایتی دستی ہتھیاروں کی جگہ بہتر قسم کے دور مار ہتھیار دریافت کر لئے تھے اور سمندری طاقت پر مکمل طور پر اپنا قبضہ قائم کر لیا تھا۔ اس کے برعکس سلطان صلاح الدین کو بارھویں صدی عیسوی میں کام کرنے کا موقع ملا جب کہ مسلمان جنگی صنعت میں دنیا کی امامت کر رہے تھے۔ اس زمانے میں شام و مصر اور عراق میں کثرت سے ایسی کارگاہیں تھیں جہاں اس وقت کی دنیا کے سب سے بہتر آلات حرب تیار ہوتے تھے۔ عباسی دور میں رومی حملوں کی مدافعت اور صلیبی جنگوں کے دور میں یورپی قوموں کی یورشیں روکنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ خاص طور پر صلیبی جنگوں کے زمانے میں اس علاقے میں جنگی صنعت کو بڑا فروغ ہوا۔ حتی کہ صلیبی لڑائیوں کے دور میں جب کوئی صلح کا وقفہ ہوتا تو اہل یورپ خاص طور پر ہتھیار خریدنے کے لئے شام و مصر کے بازاروں میں آتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں مسلم علماء کو فتویٰ دینا پڑا کہ مسیحیوں کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنا حرام ہے، کیونکہ ہم سے خریدے ہوئے ہتھیاروں کو وہ دوبارہ ہمارے ہی خلاف استعمال کریں گے۔

یہی وہ قوت ہے جس کو قرآن میں قوت مرہبہ (انفال — ۶۰) کہا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اس کو اس حد تک حاصل کرو کہ دوسروں کے اوپر تمہارا رعب قائم ہو جائے۔

قوت مرہبہ کے دو درجے ہیں۔ ایک وہ جو تمام مسلمانوں سے متعلق ہے اور ہر مسلم گروہ اپنی بساط کے مطابق اس کے حصول کی جد و جہد کر سکتا ہے۔ دوسرے وہ جس کا تعلق صرف اس مسلم معاشرہ سے ہے جو با اقتدار ہو۔ موجودہ زمانے میں ان دونوں قوتوں کے معنی کیا ہیں اور ان کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے، اس کی وضاحت کے لئے ہم جاپان اور روس کی مثال دیں گے۔

دوسری جنگ عظیم (۴۵ — ۱۹۳۹) میں جب جاپان کو شکست ہوئی اور اس کو غیر مسلح کر کے امریکی فوجوں نے جاپان پر قبضہ کر لیا۔ تو جاپان کے لئے عسکری اور سیاسی عزائم کے دروازے بند ہو گئے۔ اس موقع پر شہنشاہ جاپان ہیروہٹو (— ۱۹۰۱) نے تقریر کی اور کہا کہ "ہمیں ایک ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے، تاکہ ہم جاپان کی اگلی نسلوں کی تعمیر نو کر سکیں"۔ اب پورا جاپان غیر سیاسی میدانوں میں ترقی کی راہ پر لگ گیا۔ انھوں

نے اپنے ماسٹروں کو منسٹروں کی تنخواہ اور مجسٹریٹوں کے اختیارات دے دیئے تاکہ تعلیم کے معیار کو انتہائی حد تک بلند کر سکیں۔ صحافت کو اتنی ترقی دی کہ آج دنیا میں سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار جاپانی اخبار ہے۔ سائنس اور صنعت میں اتنا زیادہ کمال پیدا کیا کہ لوہا نہ ہونے کے باوجود وہ دنیا کی سب سے بڑی مشین (سپر ٹینکر) بناتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مصنوعات کو کوالٹی کے اعتبار سے اتنا بلند کیا کہ اس کو نقص بدرجہ صفر (ZERO DEFECTS) کے مقام تک پہنچا دیا۔ قومی احساس اور نظم و ضبط میں اتنی ترقی کی کہ آج دنیا کی کوئی قوم اس معاملہ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ ترقیاں اگرچہ بظاہر غیر عسکری اور غیر سیاسی تھیں۔ مگر وہ اتنی طاقت ور ثابت ہوئیں کہ اس کے بعد کسی مقابلہ کے بغیر امریکہ نے جاپان کی سرزمین سے اپنی فوجوں کو واپس بلا لیا۔

تعمیر و ترقی کا یہ میدان، اپنی بساط کے مطابق، ہر مسلمان گروہ کے لئے کھلا ہوا ہے خواہ وہ اقلیت میں ہو یا اکثریت میں۔ بے اقتدار ہو یا با اقتدار۔ اسی ترقی کی بدولت افریقہ کے متعدد ملکوں میں یہ حال ہے کہ ملک کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مگر عملاً سیاست اور دوسرے اجتماعی شعبوں پر عیسائی قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ علم و سائنس، صنعت و حرفت اور نظم و ضبط میں مسلمانوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر نیجیریا کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد ۶۵ فی صد ہے اور عیسائیوں کی صرف ۲ فی صد۔ مگر ۱۹۷۴ میں وہاں کی پندرہ رکنی کابینہ میں ۵ مسلم وزیر تھے اور ۱۰ عیسائی وزیر۔ اس فرق کی وجہ تعلیم میں عیسائیوں کی برتری اور مسلمانوں کی پس ماندگی ہے۔ سرکاری مدارس میں مسلم طلبہ کی تعداد ۲۵ فی صد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اعلیٰ مراحل کی تعلیم میں تناسب اور بھی کم ہو جاتا ہے جب کہ عیسائی طلبہ ملک میں دو فی صد ہونے کے باوجود تعلیمی اداروں میں بھرے ہوتے ہیں۔

دوسری نوعیت کی ایک مثال روس ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ نے اپنے حریف سودیت روس کے خلاف یہ اسکیم بنائی کہ وہ اس کے سرحدی ملکوں سے معاہدے کر کے وہاں اپنے فوجی اڈے قائم کرے اور اس کو اپنے گھیرے میں لے لے۔ ناٹو (NATO) سیٹو (CEATO) اور سنٹو (CENTO) اسی قسم کے معاہدات تھے جن کے ذریعے امریکہ نے اپنی جنگی مشین کو اٹلانٹک پار کر کے یورپ، شمالی افریقہ اور ایشیا تک پہنچا دیا، اس طرح اپنے دو درجن فوجی اڈوں کے ذریعے وہ اس پوزیشن میں ہو گیا کہ کمیونسٹ دنیا کو عین اس کی سرحدوں کے پاس نشانہ بنا سکے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ روس کو تو اپنے دشمن پر وار کرنے کے لئے زمین کے گولے کی ایک چوتھائی مسافت طے کرنی ہوگی۔ جب کہ امریکی اڈے اس کی سرحد کے اتنے قریب ہیں کہ وہ پانچ سے دس منٹ کے اندر سودیت روس کے تمام اہم ترین نشانوں پر پہنچ سکتے ہیں۔

اب روس نے یہ کیا کہ سائنس دانوں کی ایک فوج اس کام پر مامور کر دی کہ وہ ایسا تیز رفتار ہتھیار دریافت کریں جس کے ذریعہ ماسکو کے حکمراں اپنے ملک میں بیٹھے بیٹھے امریکہ کے ٹھکانوں کو نشانہ بنا سکتے ہوں۔ ستمبر ۱۹۵۹ء میں روسی راکٹ لیونک نمبر ۲ کا ٹھیک اندازہ کے مطابق چاند پر پہنچنا اس بات کا خاموش اعلان تھا کہ یہ تحقیق کامیاب ہو گئی ہے۔ زمین سے چاند کا فاصلہ روس سے امریکہ کے فاصلہ کے مقابلہ میں پچاس گنا زیادہ ہے۔

اب جو تیز رفتار راکٹ مشینوں کا بکس چاند پر پہنچا سکتا ہے، وہ بم کے گولے بھی دور دراز ملکوں میں گرا سکتا ہے۔ ریڈیائی کنٹرول کی جس اہلیت کا مظاہرہ خلائی پرواز میں ہوا، وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بعید ترین زمینی نشانوں پر نہایت صحت کے ساتھ گرائے جا سکتے ہیں۔ اس دریافت کا سامنے آنا تھا کہ امریکہ کی فوجی حکمت عملی اچانک بے بنیاد عمارت کی طرح زمین پر آ گئی۔

روس کو زمینی چیلنج دیا گیا تھا۔ اس نے اس کا آسمانی حل دریافت کر لیا۔ معلوم ہوا کہ اس دنیا میں ترقی کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالے نے طاقت و قوت کے بے پناہ امکانات رکھ دیئے ہیں اور حوصلہ اور ہمت ہو تو ہر مشکل کا ایسا بالاتر حل دریافت کیا جا سکتا ہے کہ دشمن کی ساری کارروائیاں بطل ما کانوا یعملون (اعراف — ۱۱۸) کا مصداق ہو کر رہ جائیں۔

اگرچہ اس دنیا میں اہل ایمان کا اصل مشن دعوت و تبلیغ ہے۔ مگر یہ واقعہ کہ یہ دنیا ایک مادی دنیا ہے، اور یہ واقعہ کہ یہاں ہمیشہ حق کی مخالفت کرنے والے گروہ موجود رہتے ہیں، اہل ایمان کے لئے ضروری کر دیتا ہے کہ وہ مادی اسباب کی فراہمی میں بقدر وسع پوری جدوجہد کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے ۱۳ ویں سال مکہ سے انتہائی بے سروسامانی کے ساتھ ہجرت کی۔ مگر اس کے دس برس بعد جب آپ نے فتح مکہ کے لئے مارچ کیا تو ایک طرف تبلیغی کام اس حد تک پھیل چکا تھا کہ دس ہزار مردان کار آپ کے ہمرکاب تھے۔ دوسری طرف تیاری کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے دو ہزار آدمی اس طرح زرہ پوش تھے کہ ان کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں (لا یبدی منھم سوی الحدق، طبری)

موجودہ زمانے میں اس سنت پر عمل کرنے کی اہمیت پہلے سے بھی زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ آج کی جنگوں میں عضلاتی طاقت کے بجائے مشین کی اہمیت اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ فوجی نسلوں (MARTIAL RACES) کا قدیم تصور زمانہ ماضی کا افسانہ بن گیا ہے۔ اسی طرح اقتصادی ذرائع نے موجودہ زمانہ میں اس قدر وسعت اختیار کی ہے کہ پوری انسانی زندگی اس کے تابع ہو گئی ہے۔ قدیم زمانہ میں دعوت و تبلیغ کا کوئی براہ راست تعلق اقتصادیات سے نہ تھا مگر آج اگر آپ "قلم" کو دعوت و تبلیغ کے لئے استعمال کرنا چاہیں تو عظیم اقتصادی وسائل کے بغیر اس کو موثر طور پر استعمال ہی نہیں کر سکتے۔ پھر جب اس واقعہ کو دیکھا جائے کہ دوسرے مذاہب ہوائی جہازوں اور ریڈیو اسٹیشنوں کے ذریعے اپنے دین کی تبلیغ کر رہے ہیں تو یہ اقتصادی ضرورت سیکڑوں گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شخصی ضرورت کے لئے بھی آج اقتصادی وسائل کی اہمیت پچھلے تمام ادوار سے زیادہ ہے۔ آج انسان کی حقیقی ضروریات اتنی بڑھ چکی ہیں کہ قدیم طرز کی افسانوی سادگی کے ساتھ زندگی گزارنا ممکن ہی نہیں۔

مسلمان کی اصل ذمہ داری اگرچہ دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری ہے۔ مگر مندرجہ بالا وجوہ تقاضا کرتے ہیں کہ اسی کے ساتھ یہ جدوجہد بھی بھرپور طور پر کی جائے کہ مسلمان جدید اقتصادیات میں اپنا جائز حصہ پا سکیں۔ انفرادی حیثیت سے بھی اور قومی حیثیت سے بھی۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

آواز: قدرت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ

ہم جو الفاظ بولتے ہیں، وہ بے آواز لہروں کی صورت میں ہوا پر اسی طرح سفر کرتے ہیں جس طرح پانی کی سطح پر موجیں پیدا ہوتی ہیں اور بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ایک شخص کے منھ سے نکلی ہوئی آواز کے آپ تک پہنچنے کے لئے درمیان میں ہوا کا ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ درمیانی واسطہ نہ ہو تو دو قریب بیٹھے ہوئے آدمی ایک دوسرے کا ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھیں گے مگر وہ ایک دوسرے کی بات نہ سن سکیں گے۔

اس کو مثال کے ذریعہ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ شیشہ کے ایک فانوس کے اندر برقی گھنٹی رکھ کر اسے بجایا جائے تو اس کی آواز صاف سنائی دے گی۔ لیکن اگر فانوس کے اندر کی ہوا کو پوری طرح نکال کر اسے بند کر دیا جائے اور اس کے بعد گھنٹی بجائی جائے تو آپ شیشہ کے اندر گھنٹی کو بجتا ہوا دیکھیں گے، مگر اس کی آواز نہ سنیں گے۔ کیونکہ گھنٹی کے بجنے سے جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے، اس کو قبول کر کے آپ کے کانوں تک پہنچانے کے لئے شیشہ کے اندر ہوا موجود نہیں ہے۔

مگر ریڈیائی خبر رسانی کے لئے ہوا کا ذریعہ بالکل ناکافی ہے۔ کیونکہ ہوا کے ذریعہ ہماری آواز پانچ سکنڈ میں صرف ایک میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہوا کا ذریعہ صرف قریبی ماحول میں گفتگو کے لئے کارآمد ہے۔ وہ ہماری آواز کو دور تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ ہندستان سے اگر ہم اپنی آواز کو امریکہ بھیجنا چاہیں تو ہوائی رفتار سے وہ اپنی منزل پر سات گھنٹے میں پہنچے

گی۔ ظاہر ہے کہ دوسری طرف سے جواب آنے میں بھی اتنی ہی دیر لگے گی۔ گویا نئی دہلی کا ایک شخص نیویارک میں اپنے ایک ساتھی کو ٹیلی فون کر رہا ہو تو اس رفتار سے اپنے ایک فقرہ کا جواب سننے کے لئے اس کو چودہ گھنٹہ تک انتظار کرنا پڑے گا

اگر آواز صرف ہوا کے ذریعے پھیلتی تو اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا ممکن نہ ہوتا۔ مگر قدرت نے اس کے لئے ہمیں ایک اور انتہائی تیز رفتار ذریعہ مہیا کیا ہے۔ یہ روشنی یا برقی رو ہے جس کی رفتار ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سے بھی زیادہ ہے۔ ریڈیائی پیغامات میں اسی ذریعہ سے کام لیا جاتا ہے۔ جب کوئی بولنے والا ریڈیو اسٹیشن میں لگے ہوئے مائکرو فون کے پاس آواز نکالتا ہے تو مائکرو فون آواز کو لے کر اسے برقی رو میں تبدیل کر دیتا ہے اور تار کے ذریعہ اس کو فی الفور آلہ نشر (ٹرانس میٹر) تک بھیج دیتا ہے۔ آلات نشر آواز کے پہنچتے ہی مرتعش ہو کر فضا میں دوبارہ وہی ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں جو مقرر کے بولنے سے ہوا تھا۔ اس طرح پانچ سکنڈ میں ایک میل چلنے والی آواز برقی لہروں میں تبدیل ہو کر ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی رفتار حاصل کر لیتی ہے۔ اس طرح آواز ایک سکنڈ کے ۸ ویں حصے میں پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے کیونکہ زمین کا پورا گھیرا صرف ۲۵ ہزار میل ہے۔ یہی تیز رفتار لاسلکی موجیں ہیں جن کو ہمارے ریڈیو سٹ کی آواز گیر مشین لیتی ہے اور پھر بلند آواز میں ان کا اعادہ کر دیتی ہے۔ اس طرح ہزاروں میل دور بولی ہوئی آواز کو ہم کسی تاخیر کے بغیر سننے لگتے ہیں۔

مصری ریڈیو کے ہفت روزہ ترجمان مجلۃ الاذاعۃ والتلیفزیون (۱۷ جون ۱۹۷۶) نے مولانا وحید الدین خاں کی تازہ عربی کتاب الاسلام والعصر الحدیث پر جو تبصرہ شائع کیا ہے، اس کا خلاصہ یہاں دیا جا رہا ہے۔ اس طرح کے تبصرے عرب دنیا کے تقریباً تمام قابل ذکر اخبارات و رسائل میں نمایاں طور پر شائع کئے گئے ہیں۔ یہ تبصرے بتاتے ہیں کہ سارا عالم اسلام آج ایک نئی اسلامی دعوت کے انتظار میں ہے، ایک ایسی دعوت جو ایک طرف اہل اسلام کے اندر از سر نو ایمانی حرارت پیدا کرے اور دوسری طرف دیگر اقوام تک خدا کا پیغام پہنچانے کی منصوبہ بندی کرے۔

ہندستانی اسلامی مفکر علامہ وحید الدین خاں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ انھوں نے اس سے پہلے اسلامی کتب خانہ کو الاسلام یتحدیٰ' الدین فی مواجہۃ العلم' حکمۃ الدین جیسی کتابیں دی ہیں۔ وہ ہمارے ان بہت سے اسلامی مصنفین کی طرح نہیں ہیں جو محض لکھنے پر قادر ہوتے ہیں اور ان کے بس میں صرف یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں صفحات سیاہ کرکے ان سے بیسیوں کتابیں بنا لیں، جن سے لائبریریاں تو بھر جاتی ہیں، مگر نہ وہ ہمارے اندر کوئی گونج پیدا کرتیں اور نہ ان مسلم نوجوانوں پر کچھ اثر ڈالتی ہیں جو کہ سنجیدہ اسلامی فکر کے پیاسے ہیں۔ ہمارا یہ عظیم اسلامی مفکر ان چند اصحاب قلم میں سے ہے جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ جنھوں نے اپنے لئے ایک نہایت مشکل راستہ اختیار کیا ہے، کیونکہ وہ مفکرانہ صلاحیت کے حامل ہیں نہ کہ صرف صاحب قلم ہیں۔ یہ مشکل راستہ ان چیلنجوں کا سامنا ہے جو اسلام کو داخلی اور خارجی دونوں حیثیتوں سے درپیش ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں ساٹھ سے زیادہ صفحات نہیں عام قاری اس کو ایک گھنٹہ سے بھی کم میں پڑھ لے گا۔ مگر صاحب علم قاری کے لئے اس کو سمجھنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔ کیونکہ یہ کتاب حجم کے اعتبار سے اگرچہ مختصر ہے، مگر کیفیت کے اعتبار سے وہ گہری سوچ کی طالب ہے کیونکہ وہ نہایت اہم سوالات پر بحث کرتی ہے۔ ان سوالات پر اس سے پہلے بھی بحثیں کی جا چکی ہیں مگر جو چیز یہاں نئی ہے وہ اس کے مفکر مولف کا منہج اور طریقہ جو کہ موضوعی اور مجرد ہے۔ اور عاقلانہ منطقیت پر مبنی ہے نہ کہ اس دینی جوشیلے پن پر جو کہ ہمارے علاقائیت پسند اسلامی مصنفین کے محدود افکار پر چھایا رہتا ہے۔

اس عظیم اسلامی مفکر نے فقط میسر شدہ دینی حوالوں پر اکتفا نہیں کیا ہے جن پر عموماً مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے اعتماد کر لیا جاتا ہے۔ بلکہ انھوں نے دنیا کی جدید فکری تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے، خصوصاً ان تحریکوں کا جو فکر اسلامی سے متصادم ہیں۔ انھوں نے ان تحریکوں کے نقائص اسی معیار استدلال سے واضح کئے ہیں جو کہ ان تحریکوں کے نزدیک قابل اعتماد ہیں۔ اس طرح یہ عظیم مفکر اس پر قادر ہوا ہے کہ عام انسانیت کی سطح پر اسلامی فکر کے لئے جگہ پیدا کرے۔

زیر تبصرہ کتاب (الاسلام والعصر الحدیث) جو کہ ہمارے

كتب

الإسلام .. والعصر الحديث

"للعلامة وحيد الدين خان"

المفكر الاسلامي الهندي العلامة وحيد الدين خان ، ليس في حاجة الى التعريف به ، فهو الذي قدم للمكتبة الاسلامية من قبل .. الاسلام يتحدى - الدين في مواجهة العلم - حكمة الدين .. وهو ليس ككثير من كتابنا الاسلاميين الذين يملكون - فحسب - القدرة على الكتابة ، وفي استطاعتهم أن يسودوا آلاف الصفحات ليحولوها الى عشرات الكتب ، تتخم بها المكتبات دون أن يكون لها صدى في نفوسنا ، او تاثير في تفكير شبابنا المسلم المتعطش الى الفكر الاسلامي الجاد .. وانما مفكرنا الاسلامي الكبير من الكتاب القلائل ، الذين يعدون على الاصابع ، والذين قد اشتقوا لانفسهم طريقا وعرا ، لانهم يملكون القدرة على التفكير لا القدرة على الكتابة وحدها .. هذا الطريق الوعر هو طريق المواجهة بالاسلام ضد التحديات التي تهب عليه من داخله ومن خارجه على السواء ..

ان صفحات الكتاب لم تتجاوز الستين صفحة ، قد يقرؤه القارىء العادي في اقل من ساعة ، لكن القارىء المثقف لا يستوعبه الا في بضعة ايام ، لان الكتاب على تواضعه من حيث الكم ، يحتاج الى تامل عميق من حيث الكيف ، لانه يناقش قضايا على جانب من الاهمية ، هذه القضايا ، هي : الثورة الفكرية قبل الثورة التشريعية - حوار مع المتغربين - امكانيات لم يستخدمها العالم الاسلامي - الايمان والحركة الايمانية - ثم نحو بعث جديد .. ومثل هذه القضايا قد بحثت من قبل ونوقشت لكن الجديد فيها هنا هو منهج الكاتب المفكر ، المنهج الموضوعي المجرد ، القائم على المنطق الواعي لا على العاطفة الدينية التي تشكل عقليات الكثير من كتابنا الاسلاميين الاقليميين في تفكيرهم المحدود ..

فالمفكر الاسلامي الكبير في بحثه ، لا يعكف على النصوص الدينية الميسرة له ، ليعتمد عليها وحدها مجردة في مناقشة القضايا ، بل يتابع مسار الحركة الفكرية الحديثة في العالم ، ولا سيما المعارض منها للفكر الاسلامي ، فيكشف عن قصورها بنفس المقاييس المنهجية عند أصحابها ، وبذلك يستطيع المفكر الكبير أن يفسح مكانا للفكر الاسلامي على مستوى الانسانية العامة ..

وبعد - فان الدراسة التي بين ايدينا .. الاسلام والعصر الحديث .. والتي قامت بنشرها دار المختار الاسلامي بالقاهرة .. دراسة جادة بكل ما في هذه الكلمة من معنى ، تجعلنا نزداد اقتناعا بان المفكر المسلم العلامة وحيد الدين خان يتميز بانه كاتب يخطط لما يكتبه ، ويرسم المنهج لما يفكر ، ليصل الى النتيجة التي يبتغيها ، والنتيجة عنده ذات شعب ثلاث : الاولى مواجهة الافكار التي تتحدى الاسلام وتتربص به ، والثانية : الضرب على الافكار الدخيلة على الاسلام ، التي ابتلى بها الاسلام على فترات من الغفلة ، والثالثة والاخيرة ، صياغة الفكر الاسلامي صياغة جديدة تجعله جديرا بان يحتل المكان اللائق به ، وجديرا ايضا بان يمثل الاسلام الصحيح الذي رضيه الله لعباده دينا ..

مجلة الاذاعة والتليفزيون (القاهرة) ١٩٧٦/٦/١٧

سامنے ہے اور جس کو قاہرہ کے المختار الاسلامی نے شائع کیا ہے۔ اپنے پورے مفہوم کے اعتبار سے ایک وقیع مطالعہ ہے۔ اس نے ہمیں اس مزید یقین سے ہم کنار کیا ہے کہ مسلم مفکر علامہ وحید الدین خاں کا امتیاز یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، پہلے اس کی پلاننگ کرتے ہیں۔ اپنی تفکیر کا منہج خود طے کرتے ہیں تاکہ اپنے مطلوبہ نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ نتیجۃً ان کے یہاں تین شقوں میں تقسیم ہوتا ہے: اول، اسلام کو چیلنج کرنے والے اور اس کا نشانہ بنانے والے افکار کا سامنا کرنا۔ دوم، ایسے افکار کی سرکوبی جو اسلام کے اندر گھس آئے ہوں اور جو غفلت کے زمانوں میں اسلام کے لئے آزمائش بنے۔ سوم، اسلامی فکر کو نئے طریقے سے اس طرح ترتیب دینا کہ وہ اس مقام کو حاصل کرے جس کا وہ مستحق ہے اور اس قابل ہو جائے کہ اس حقیقی دین کی نمائندگی کر سکے جس کو اللہ نے اپنے بندوں کیلئے پسند فرمایا ہے۔

وہ صحافت کو حقیر پیشہ سمجھتے رہے

شیخ علی یوسف انیسویں صدی کے ایک مصری ادیب تھے جو ایک عربی جریدہ "المؤید" کے اڈیٹر تھے۔ انھوں نے مصر کی ایک خاتون سے شادی کی جس کا نام صفیۃ السادات تھا۔ یہ ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور اپنے والد کی اجازت کے بغیر شیخ علی یوسف سے شادی کر لی تھی۔ بعد کو جب ان کے خاندان والوں کو معلوم ہوا کہ ان کے شوہر ایک صحافی ہیں تو یہ بات انھیں اپنے خاندانی وقار کے خلاف معلوم ہوئی کہ ان کے یہاں کی ایک لڑکی ایسا گھٹیا پیشہ رکھنے والے ایک آدمی سے شادی کرلے۔ انھوں نے خاتون پر زور ڈال کر انھیں راضی کیا کہ وہ عدالت میں تفریق کی درخواست دے کیونکہ ان کا شوہر شریعت کے مطابق ان کا کفو نہیں ہے اور وہ صحافت جیسا غیر شریف پیشہ کرتا ہے۔ یہ دعوی قاضی شرع (شیخ ابو خطوۃ) کی عدالت میں پیش ہوا اور قاضی نے مقدمہ کی سماعت کے بعد فیصلہ کیا کہ ایک شخص جو صحافی ہو، وہ ایک شریف خاتون کا کفو نہیں ہے اور شیخ علی یوسف اور ان کی بیوی کے درمیان تفریق کرادی۔

سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ – ۱۸۹۷) جن دنوں آستانہ (ترکی) میں تھے، ان کی ملاقات شیخ حسین الجسر (۱۸۴۵ – ۱۹۰۹) سے ہوئی۔ شیخ جسر اپنے زمانے میں شام کے بڑے علماء میں تھے۔ تاہم وہ جریدہ طرابلس میں مقالات لکھا کرتے تھے۔ جمال الدین افغانی کو ان کے بعض خیالات سے اختلاف تھا۔ اتفاقاً دونوں کی ملاقات المابین (سلطانی سرا) میں ہوئی۔ جمال الدین افغانی نے ان پر تنقید شروع کی۔ شیخ حسین جسر نے جواب میں کچھ کہا۔ اس کے بعد جمال الدین افغانی بلند آواز سے بولنے لگے۔ شیخ حسین جسر نے کہا: آہستہ بولئے، کہیں المابین کے لوگ سن نہ لیں کہ میں صحافی ہوں اور رسائل میں مضامین لکھتا ہوں۔ یہ سن کر جمال الدین افغانی غضبناک ہو گئے اور کہا: ولماذا یا استاذ تحاذر ھذا وتأبی الانتساب الی الصحافۃ (آپ اتنا ڈرتے کیوں ہیں اور صحافت سے اپنی نسبت کا انکار کر رہے ہیں) صحافت ایک اچھا کام ہے۔ میں خود صحافی ہوں۔ پیرس سے میں نے العروۃ الوثقیٰ کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا۔ شیخ جسر نے اس کو نہیں مانا، انھوں نے کہا:

ان مثلہ فی انتسابہ الی علم الدین یزدری بہ فی نظر الناس الاشتغال بالصحافۃ

الوریہ، ۲۱۱

ان کے (شیخ جسر) جیسا ایک شخص جو علم دین کا حامل ہونے کی حیثیت سے متعارف ہے، اس کا صحافت میں مشغول ہونا اس کو لوگوں کی نظر میں گرادے گا۔

ایک ملاقات

ناندیڑ، تقسیم سے پہلے ریاست حیدرآباد کا حصہ تھا۔ اب وہ مہاراشٹر کا ایک ضلع ہے۔ دہلی سے ۱۶۵۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر آباد اس علاقہ میں اگر آپ اس کے ماضی کے آثار دیکھنا چاہیں تو وہ اس کی روزمرہ کی سرگرمیوں میں کہیں نظر نہ آئیں گے۔ اس واقعہ کو آپ گزری ہوئی کہانی کے طور پر ہی کسی سے سن سکتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہاں ایسے لوگ تو بہت ہیں جو بے رحم حال کو اپنی محرومیوں کا ذمہ دار سمجھتے ہوں، مگر ایسے لوگوں کی تلاش سعی لاحاصل سے زیادہ نہیں جو زندگی کی اس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ حال دراصل ماضی ہی کا دوسرا نام ہے۔ افراد ہوں یا قومیں۔ اپنے آنے والے دنوں میں وہ وہی چیز کاٹتی ہیں جس کا بیج انھوں نے اپنے پچھلے دنوں میں بویا تھا۔

جولائی ۱۹۷۵ء کا آخری اور اگست کا پہلا ہفتہ میرا اس علاقہ میں گزرا۔ ناندیڑ سے ۵۰ میل کے فاصلے پر اس کا ایک قصبہ کھیڑ ہے۔ یہ حیدرآباد سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ کھیڑ میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی، ان میں سے ایک قابل ذکر شخص کشن جیونت راؤ پٹیل (پیدائش ۱۹۴۳) ہیں۔ چھایا اسٹوڈیو کے نام سے یہاں ان کی فوٹوگرافی کی دکان ہے۔ ان کی مادری زبان مرہٹی ہے۔ ہندی بھی اچھی جانتے ہیں۔ انھوں نے ہندی زبان میں متعدد اسلامی کتابیں پڑھی ہیں۔ قرآن کا ہندی ترجمہ روزانہ اہتمام سے پڑھتے ہیں۔ چار بار مکمل ترجمہ پڑھ چکے ہیں۔ اب پانچویں بار پڑھنا شروع کیا ہے۔

۲۶ جولائی کی شام کو ہم ان کے کھیتوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ برسات کے موسم کی وجہ سے ہر طرف ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ ہرے بھرے کھیتوں سے دور پہاڑ کا منظر اس میں مزید حسن پیدا کر رہا تھا "آپ کی فصل ماشاء اللہ آس پاس کے سب کھیتوں سے بہتر ہے" میں نے کہا۔ "یہ خدا کی دین ہے، ورنہ ہم نے تو کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی" انھوں نے جواب دیا۔ ایک اور صاحب جو اس وقت ہمارے ساتھ تھے انھوں نے بتایا کہ کشن پٹیل صاحب اپنی پیداوار میں سے باقاعدہ عشر نکالتے ہیں۔ "یہ اسی کی برکت ہے" انھوں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا اور کشن پٹیل صاحب نے مسکرا کر اس کی تصدیق کی۔

قرآن کے سلسلے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اس میں مجھے کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آئی۔ سب نہایت عمدہ باتیں ہیں۔ آدمی اگر ان کو اپنا لے تو اس کی زندگی سدھر جائے۔ میں نے کہا بطور اعتراض نہیں تاہم بطور سوال آپ کے دماغ میں کچھ باتیں ہو سکتی ہیں، ان کو بتایئے تاکہ ان پر گفتگو کی جائے۔

انھوں نے ایک سوال یہ رکھا کہ عبادت نماز روزہ کا نام ہے یا عمل کا۔ میں نے کہا عبادت اصلاً تو نماز روزہ ہی کا نام ہے۔ تاہم جب آدمی کے اندر صحیح معنوں میں نماز روزہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے اخلاق و معاملات میں بھی لازمی طور پر اس کی جھلک آنے لگتی ہے۔ اس لحاظ سے عمل بھی عبادت کے تقاضوں میں شامل ہے۔ انھوں نے بعض اسلامی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں لکھا ہے کہ نماز عملی زندگی کے لئے ٹریننگ ہے۔ میں نے کہا، اس کا مطلب یہ ہے

کہ نماز آدمی کی اصل زندگی سے الگ نہیں۔ جب ایک آدمی حقیقی معنوں میں نمازی بن جاتا ہے تو اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک ایسی طبیعت ابھرتی ہے جو برائیوں سے نفرت کرنے لگتی ہے اور بھلائیوں کو چاہنے لگتی ہے۔ باقی جہاں تک نماز کی اصل حقیقت کا تعلق ہے، تو نماز اللہ سے نزدیکی کا نام ہے، جیسا کہ قرآن کی سورہ نمبر ۹۶ میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ یہ بات قرآن و حدیث میں بھی بتائی گئی ہے اور تجربہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جب سجدہ میں سر رکھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل خدا کے پاس پہنچ گیا ہے۔ یہ نزدیکی کا احساس کسی بھی دوسری چیز سے حاصل نہیں ہوتا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ایک بندہ کے لئے سب سے بڑی چیز یہی ہے کہ وہ اپنے مالک کے نزدیک ہو جائے۔

سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۶۹ کے تحت انھوں نے سوال کیا کہ اس سے تو یہی بات نکلتی ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور عیسائی وغیرہ بھی نجات یافتہ ہیں۔ اسی طرح سورہ حج آیت نمبر ۴۰ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسجدوں کے علاوہ گرجوں وغیرہ میں خدا کا جو نام لیا جاتا ہے، قرآن اس کی بھی تصدیق کر رہا ہے۔

پہلی آیت کے سلسلے میں میں نے کہا کہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نجات کا تعلق کسی گروہ یا نسل سے نہیں ہے خواہ وہ مسلمانوں کا گروہ ہو یا یہودیوں کا یا عیسائیوں کا۔ بلکہ عمل سے ہے، اور عمل نام ہے اس کا کہ آدمی خدا پر ایمان لائے، آخرت پر یقین کرے اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرے۔ اس آیت میں گروہی نجات کی نفی کرتے ہوئے عقیدہ و کردار کو نجات کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ خدا کا حقیقی ذکر کہاں ہوتا ہے۔ اس میں دراصل اللہ کا یہ قانون بتایا گیا ہے کہ وہ کسی ایک گروہ کو مستقل طور پر اقتدار پر قابض رہنے نہیں دیتا۔ اگر ایسا نہ ہو تو حکمراں طبقوں میں اجارہ داری کی ذہنیت پیدا ہو جائے اور ان کا ظلم اس قدر بڑھ جائے کہ وہ نہ صرف اپنے سیاسی مخالفوں کو قتل کریں بلکہ معاشرہ کے بے ضرر طبقات کو بھی روند ڈالیں، حتیٰ کہ عبادت خانوں میں خاموشی کے ساتھ خدا کا نام لینے والے لوگوں کو بھی۔

"حضرت اسود جس کو حج میں چومتے ہیں، یہ کیا چیز ہے، کیونکہ قرآن میں حج کے جو احکام ہیں ان میں حضرت اسود کا کوئی ذکر نہیں"

یہ "حضرت اسود" نہیں بلکہ حجر اسود ہے۔ اس کے معنی ہیں کالا پتھر۔ یہ کعبہ کے ایک کونے میں لگا ہوا ہے اور وہیں سے طواف شروع کرتے ہیں۔ اس کے چومنے کے بارے میں میں نے بتایا کہ اس کا کوئی تعلق حجر اسود کے "حضرت" ہونے یا مقدس سمجھنے سے نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر نے فرمایا: یہ ویسا ہی ایک پتھر ہے جیسا کہ عام پتھر۔ حج کے موقع پر جب ایک مسلمان حجر اسود کو چومتا ہے یا کعبہ کے غلاف سے لپٹتا ہے تو یہ اُس کے اس جذبہ کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب سے لپٹ جائے اور اس کے قدموں کو چوم لے۔ اس میں ہرگز ایسا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا کہ حجر اسود یا غلاف کعبہ کے اندر خود کوئی تقدس ہے یا وہ آدمی کو نفع نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

پھر یہ معاملہ صرف حجر اسود تک محدود نہیں، حقیقت یہ ہے کہ مومن کی زندگی میں ایسے مواقع بار بار بلکہ روزانہ آتے رہتے ہیں۔ جب وہ سجدہ میں اپنا سر رکھتا ہے تو زمین کا وہ ٹکڑا اس کے لئے "حجر اسود" بن جاتا ہے جہاں اس کی

پیشانی اپنے رب کی دھرتی کو چھو رہی ہو۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا سر خدا کے قدموں سے لپٹ گیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کیفیت کبھی اتنی شدت سے طاری ہوتی ہے کہ اس کا جی چاہتا ہے کہ اپنا سر ہی نہ اٹھائے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ درخت کی ایک ہری پتی کو دیکھتا ہے یا ایک خوبصورت پھول اس کے سامنے آتا ہے، تو خدا کی یاد اور محبت ایسے جذبہ کی صورت میں ڈھل جاتی ہے کہ وہ اس پتی اور پھول کو خدا کا ایک جلوہ سمجھ کر اس کو اپنی آنکھوں سے لگا لیتا ہے۔ خدا سے چمٹ جانے اور اس کے قدموں کو چوم لینے کا یہی جذبہ جو مومن کی زندگی میں روزانہ کسی نہ کسی شکل میں ظہور میں آتا ہے، وہ حج کے موقع پر حجر اسود کو چومنے یا غلاف کعبہ سے لپٹنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ حجر اسود مومن کی عام اور روزمرہ زندگی ہی کا ایک تجربہ ہے، وہ نہ کوئی راز ہے اور نہ کوئی منفرد اور مخصوص چیز۔ اگرچہ عام انسان اکثر خاص پتھر سے اس کیفیت کو پاتے ہیں جو کعبہ میں نصب ہے۔ مگر جو لوگ گہرائی کے ساتھ خدا کو پا لیتے ہیں، ان کی نظر تعینات سے بلند ہو جاتی ہے۔ ان کے لئے زمین کا ہر ذرہ حجر اسود ہے اور درخت کا ہر پتہ غلاف کعبہ۔

"سورۂ آل عمران آیت نمبر ۳۷ میں ہے کہ حضرت مریم کے پاس جب حضرت زکریا آتے تو وہ ہمیشہ ان کے پاس رزق پاتے۔ یہ رزق کیا آسمانی پھل ہوتا تھا"

"عوام میں یہی مشہور ہے کہ وہ آسمانی پھل ہوتا تھا، مگر خود آیت میں اس کی تردید موجود ہے۔ آیت میں بتایا گیا ہے کہ وکفلہا زکریا یعنی حضرت مریم کی کفالت حضرت زکریا کرتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ جب ان کے کفیل اور ان کی ضروریات کے ذمہ دار حضرت زکریا تھے تو آسمان سے ان کا کھانا آنے کی کیا ضرورت تھی۔ آسمان سے اس قسم کی مدد کبھی خواہ مخواہ نہیں آتی بلکہ صرف حقیقی ضرورت کے وقت اور انتہائی مخصوص حالات میں آتی ہے۔

یہ رزق حقیقۃً رزق معرفت تھا۔ جب ایک شخص کے اندر ایمان کا اجالا پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو ساری دنیا اس کے لئے علم و معرفت کا دسترخوان بن جاتی ہے۔ ہر واقعہ اور ہر مشاہدہ میں اس کو خدائی انوار دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس کی روح کو ایک اعلیٰ رزق کی خوراک پہنچنے لگتی ہے۔ حضرت مریم کی باتوں میں اسی "رزق" کے جلوے حضرت زکریا کو نظر آئے تھے۔

"قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ زمین و آسمان پر غور کرو، کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن یہ چاہتا ہے کہ لوگ سائنس کے علوم پڑھیں"

میں نے کہا، یہ صحیح ہے کہ سائنس زمین و آسمان ہی کے علوم کا نام ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ سائنسی علوم سے خدا کی معرفت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مگر جہاں تک قرآن کے اس قسم کے ارشادات کا تعلق ہے، اس سے مراد معروف سائنس کے علوم نہیں ہیں۔ بلکہ زمین و آسمان کی آیات (نشانیوں) پر غور کرنا ہے۔ زمین و آسمان کا سائنسی مطالعہ اور زمین و آسمان کی نشانیوں پر غور کرنا، دونوں میں بہت فرق ہے۔ سائنسی مطالعہ یا تو مجرد مطالعہ ہے یا افادی مطالعہ۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس داں کی ساری توجہ ٹکنکل پہلوؤں پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن یہ چاہتا ہے کہ زمین و آسمان کے نظام میں جو بے شمار سبق کے پہلو ہیں، ان پر لوگ غور کریں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح قرآن میں اللہ تعالےٰ نے

اپنے علم کو کھولا ہے، اسی طرح اس نے کائنات کے اندر اپنی معرفت کے شرارے رکھ دیئے ہیں۔ جو لوگ اس نظر سے کائنات پر غور کرتے ہیں، وہ اس کے اندر ایمان و معرفت کے اتھاہ خزانے پا لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس مشاہدہ کے آخری مقام پر پہنچ کر وہ پکار اٹھتے ہیں کہ کتابیں صرف دو ہیں: قرآن اور کائنات۔

"قرآن کی سورہ نمبر ۳۳ میں کہا گیا ہے کہ منھ بولا بیٹا (لے پالک) بنانا غلط ہے۔ دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی سے کہہ دے کہ تجھ کو طلاق ہے تو اس پر طلاق پڑ جاتی ہے۔" یہ سوال پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا "ایک جگہ قرآن کہہ رہا ہے کہ منھ بولے لفظوں سے کوئی کسی کا بیٹا نہیں ہوتا، دوسری جگہ منھ سے کچھ الفاظ نکال دینے سے ایک شخص کی بیوی اس کی بیوی نہیں رہتی۔"

میں نے کہا کہ یہ سوال میرے لئے نیا ہے اور اس کا جواب میں کل دوں گا۔ اگلے روز میں نے بتایا کہ دونوں مثالوں میں فرق ہے۔ بیوی کا معاملہ یہ ہے کہ نکاح کے ذریعے ایجاب و قبول سے وہ کسی کی بیوی بنتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ رشتہ لفظوں کے ذریعے قائم ہوتا ہے، اس لئے لفظوں ہی سے وہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ مگر بیٹے کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ بیٹا پیدائش سے وجود میں آتا ہے۔ اس لئے لفظوں کے ذریعے نہ کوئی کسی کا بیٹا بن سکتا نہ لفظوں کے ذریعے وہ کسی کی فرزندی سے الگ ہو سکتا۔

"مسلمانوں میں جو لوگ ایسے ہیں کہ محض مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں مگر اسلام پر ان کا عمل نہیں، وہ باعتبار حقیقت کافروں کی مانند ہیں۔ پھر آپ ایسے لوگوں کو مسلمان کیوں کہتے ہیں، ان کے کفر کا اعلان کیوں نہیں کرتے؟"

میں نے کہا اسلام کا اصل تعلق آخرت سے ہے، وہاں کسی شخص کو جو چیز ملے گی، وہ اس کی اصل حقیقت کی بنیاد پر ملے گی نہ کہ محض شہرت اور نام کی بنیاد پر۔ باقی جہاں تک دنیا کا تعلق ہے، یہاں اس کے سوا کوئی اور قابل عمل صورت نہیں کہ جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے، ہم اس کو مسلمان سمجھیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو معاشرہ کے اندر بڑا انتشار پیدا ہوگا، ان کی اصلاح کے لئے تو ہم ان سے سب کچھ کہہ سکتے ہیں، مگر ہم ان کے اوپر جج بن کر نہیں بیٹھ سکتے۔

"ایک شخص کا نام رابرٹسن ہے، مگر وہ خدا اور رسول پر ایمان رکھتا ہے اور ان ساری باتوں کو مانتا ہے جو اسلام میں بتائی گئی ہیں۔ اگر وہ رابرٹسن نام کے ساتھ ہی مر جاتا ہے تو اس کی نجات ہوگی یا نہیں۔"

میں نے کہا کہ آخرت کی نجات کا کوئی بھی تعلق نام یا اعلان سے نہیں ہے۔ حنظلہ ایک مسلمان صحابی کا نام تھا اور حنظلہ بن ابوسفیان ایک کافر بھی تھے جو بدر میں مارے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو واقعات ملتے ہیں، ان میں آپ نے صرف چند ہی لوگوں کے نام تبدیل کئے۔ مثلاً ایک شخص کا نام عبد شر تھا، آپ نے اس کا نام عبد خیر رکھ دیا۔ اس کے علاوہ آپ سے پہلے جو انبیاء دوسری قوموں اور دوسری زبانوں میں آئے، ان کے یا ان کے ساتھیوں کے نام عربی نہ تھے بلکہ ان کی اپنی زبان یا رواج کے مطابق تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ نجات کا معاملہ تمام تر خدا اور بندے کے درمیان کا ایک معاملہ ہے۔ اس نجات کے لئے اصل چیز اگرچہ ایمان ہے مگر ایمان کی کچھ علامت اس کی زندگی میں بھی ظاہر ہونی چاہئے۔ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا ہم آپ پر ایمان لاتے ہیں مگر ہم نہ زکوٰۃ دیں گے

نہ نماز پڑھیں گے۔ آپ نے فرمایا: لاخیر فی دین لا رکوع فیہ (اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں خدا کے آگے جھکنا نہ ہو) جب ایک شخص دل سے خدا کو مانتا ہے تو اس کے جسم اور اس کے مال اور تعلقات میں بھی خدا پرستی کا اظہار ہونا چاہئے۔ کوئی آدمی میرے ایمان اور خدا پرستی کو نہ جانے تو کوئی حرج نہیں مگر خدا کو تو جاننا چاہئے۔ خدا کے سامنے تو بہر حال اس کا اظہار ہونا چاہئے خواہ پردہ کے اندر چھپ کر ہی کیوں نہ ہو۔

"عشر کس کو دینا چاہئے؟"

میں نے کہا کہ عشر و زکوٰۃ ایک قسم کا اجتماعی ٹیکس ہے۔ اس کی ادائگی کی اصل صورت تو یہ ہے کہ ایک اجتماعی ادارہ ہو اور وہ اس کو وصول کر کے مقررہ مدوں میں اس کو خرچ کرے۔ مگر آج چونکہ ایسا کوئی ادارہ قائم نہیں ہے، اس لئے موجودہ صورت میں تو یہی ہو سکتا ہے کہ اپنی سمجھ کے مطابق اس کو ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے، یا اوپر جو مدیں قانونی طور پر مقرر ہیں، ان میں اس کو خرچ کر دیا جائے۔

انھوں نے بتایا کہ فوٹو گرافی کا کام چھوڑ کر میں کوئی دوسرا دھندا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کام کی تبدیلی کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ میں نے اس کام میں کافی پیسہ کمایا اور اب بھی میرے لئے اس میں اچھا میدان ہے۔ مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب میں اس کام کے قابل نہیں رہا۔ فوٹو گرافی کے کام میں کامیابی کے لئے نمائشی ذہنیت اور موقع پرستی بہت ضروری ہیں۔ مگر اب میرا مزاج بدل گیا ہے۔ اب میں سادہ زندگی اور جائز کاروبار کو اپنانا چاہتا ہوں، اور اس طرح کی زندگی کے ساتھ فوٹو گرافی کے کام کا جوڑ نہیں بیٹھتا۔ اس لئے اب میں نے سوچا ہے کہ اپنی موجودہ دکان کے اوپر کچھ کمرے بنوا کر فوٹو گرافی کا کام کسی کی شرکت میں اوپر منتقل کر دوں، اور نیچے خود کرانہ کی دکان کھول لوں۔

سوال وجواب

سوال: قرآن میں ہے کہ "اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو"۔ یہ آیت مجھے بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ بظاہر اس میں ہلاکت اور خطرہ والے راستہ سے بچ کر چلنے کی تعلیم ہے۔ مگر اسی کا نام تو ہلاکت ہے کہ آدمی خطرات کے راستہ پر چلنے سے ڈرے اور رسک نہ لینا چاہے۔ فرد کا معاملہ ہو یا قوم کا، تمام بڑی بڑی ترقیاں انھیں کو ملتی ہیں جو اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈال کر اقدام کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ زندگی کی اس حقیقت کو اسمٰعیل میرٹھی نے بڑی خوب صورتی سے دو شعروں میں بیان کر دیا ہے:

گھوڑ دوڑ میں کدائی کی باری تھی ایک دن ترکی پہ کوئی تازی پہ اپنے سوار تھا
جو ہچکچا کے رہ گیا سو رہ گیا ادھر جس نے لگائی ایڑ وہ خندق کے پار تھا

جس قوم کا نظریہ یہ ہو کہ "خطرات سے بچ کر چلو" وہ قوم کبھی اونچی کامیابیاں حاصل نہیں کر سکتی۔

جواب: زندگی کی حقیقت جو آپ نے بیان کی، وہ صدفی صد صحیح ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ رسک کے بغیر کوئی کامیابی نہیں ہوتی۔ مگر آیت کا جو مطلب آپ نے لیا، اصل مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ پوری آیت یہ ہے:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ وَاَحْسِنُوْا

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (کہ خرچ کرنے سے رک جاؤ) اور کام کو خوب اچھی طرح کرو۔

بقرہ — ۱۹۵

دین کی ضرورتوں میں اپنے جان و مال کو خرچ کرنا، اپنی ذاتی ضرورتوں میں کمی کئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہا گیا کہ خواہ اپنی ذات کے لئے کمی کرنا پڑے، مگر دین کے لئے جدوجہد کو بہر حال جاری رکھو۔ کیوں کہ اجتماعی زندگی برباد ہو جائے تو فرد بھی اپنے آپ کو بربادی سے بچا نہیں سکتا۔ اسی لئے ان راہوں میں خرچ کرتے رہو جن سے اجتماعی زندگی طاقت ور ہوتی ہے

اس آیت کے سلسلہ میں حضرت حذیفہ اور حضرت ابو ایوب انصاری کی روایت حدیث کی کتابوں میں آئی ہے جو اس کے مفہوم کو پوری طرح واضح کر دیتی ہے۔ ان کے نزدیک ہلاکت میں ڈالنے کا مطلب ہے اپنے مال اور اپنے گھر میں بیٹھ رہنا اور جہاد کو چھوڑ دینا (التهلكة الاقامة فی الاهل والمال وترك الجهاد کشاف)

بخاری نے حضرت حذیفہ سے اس آیت کی مختصر شان نزول نقل کی ہے۔ اس کی صراحت حضرت ابو ایوب انصاری کی حدیث میں ہے جس کو ابوداؤد، ترمذی، حاکم، نسائی، ابن حبان وغیرہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے شرط شیخین پر اس کو صحیح کہا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری فرماتے ہیں کہ ہم انصار لوگ جب کچھ لڑائیاں آنحضرت کی ہمراہی میں لڑ چکے تو ایک دن ہم میں سے کچھ لوگوں نے آپس میں خفیہ مشورہ کیا کہ اب تو رسول اللہ

کے ساتھ بہت اہل اسلام جمع ہو لئے ہیں، اگر ہم چندلوں لڑائیوں میں اپ لے ساتھ نہ جائیں تو اپی اقتصادیات کو درست کر سکتے ہیں اور مدتوں باہر رہنے سے جو گھر بار اجڑ گئے ہیں ان کی تلافی کی جا سکتی ہے اس وقت اللہ تعالےٰ نے یہ آیت اتاری۔ اور آگاہ کیا کہ اس طرح کے اخراجات سے ہاتھ روکنا ہلاکت کا باعث ہے، اپنے آپ کو اس ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور دین کے لئے جان و مال خرچ کرنے میں لگے رہو۔

یہ آیت خطرات اور اندیشوں کے علی الرغم حق کی راہ میں اقدام کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ نہ یہ کہ آدمی خطرات اور اندیشوں سے گھبرا کر ایسا اقدام کرنے سے رک جائے۔

Americans turning religious

سائنس اور صنعت کی ترقیاں انسان کو خدا سے دور نہیں کرتیں

عام طور پر مشہور ہے کہ امریکہ ایک سیکولر اور تشکک قوم ہے۔ مگر گیلپ پول کے ذریعہ دو سال تک جائزہ لینے کے بعد جو حقائق سامنے آئے ہیں، وہ اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ امریکی لوگ غیر معمولی حد تک مذہبی ہیں اور یہ ملک فی الواقع احیائے روحانیت کے نئے مرحلے میں ہے۔

امریکہ کے ۹۴ فی صد لوگ خدا کے معتقد ہیں۔ ۶۹ فی صد زندگی بعد موت پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ انکشاف ایک رپورٹ میں کیا گیا ہے جو واشنگٹن سے "ریلیجن ان امریکا" کے عنوان سے چھپی ہے۔

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں کیا کیا مذہبی عقائد ہیں اور ان کے رہن سہن کے طریقے کیا ہیں۔ گیلپ انٹرنیشنل نے یہ جائزہ چارلس ایف۔ کیٹرنگ فاؤنڈیشن کی فرمائش پر کیا ہے۔

رپورٹ بتاتی ہے کہ امریکی عوام تمام صنعتی قوموں میں سب سے زیادہ مذہبی لوگ ہیں۔ مذہب پر عقیدہ کا خاتمہ ممکن طور پر بعض یورپی ملکوں اور دنیا کی بعض دوسری قوموں میں متوقع ہو سکتا ہے۔ امریکہ کا تقابل صرف افریقہ اور مشرق بعید سے کیا جا سکتا ہے جہاں اب بھی عوام پر مذہب کی گرفت مضبوط ہے۔ جاپان اور سکینڈی نیویا کے عوام، تمام ترقی یافتہ قوموں میں سب سے زیادہ غیر مذہبی پائے گئے ہیں۔

۱۹۶۰ کے بعد کے سالوں میں جب کہ امریکہ بحران سے دوچار تھا، لوگوں میں مذہب سے دل چسپی اور مذہبی عمل کم ہو گیا تھا۔ مگر اب صورت حال اس سے مختلف ہے امریکی عوام کی ۵۶ فی صد تعداد نے جائزہ کے دوران بتایا کہ مذہبی عقیدہ "بہت اہم" ہے، ۳۰ فی صد نے اس کو "مناسب حد تک اہم" بتایا۔ صرف ۵ فی صد نے یہ جواب دیا کہ مذہب کی کوئی اہمیت نہیں۔

(ہندستان ٹائمس ۲۴ جولائی ۱۹۷۶)

اسلامی مرکز کا مقصد، اسلام کا پیغام سارے انسانوں تک پہنچانا ہے۔

ختم نبوت کے بعد، امت محمدی مقام نبوت پر ہے۔ مسلمانوں کو اب قیامت تک ٹھیک وہی کام انجام دینا ہے جس کے لئے اس سے پہلے پیغمبر آتے تھے۔ پیغمبر اپنے رب کے یہاں صرف اس وقت بری الذمہ ہو سکتے تھے جب کہ وہ اس پیغام کو اپنے تمام مخاطبین تک پہنچا دیں جو ان کو وحی آسمانی کے ذریعے دیا گیا ہے۔ اسی طرح امت محمدی کی نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ قوموں کے سامنے خدا کے دین کی گواہ بن کر کھڑی ہو، وہ لوگوں کو آنے والے یوم الحساب سے آگاہ کرے۔ اگر امت اس دعوتی ذمہ داری کو ادا نہیں کرتی تو کوئی بھی دوسری چیز اس کو نجات دینے والی نہیں بن سکتی، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

پیغام آخرت کا حامل ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی لازمی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ دوسری قوموں سے وہ دنیوی مفادات کے لئے کشمکش کرنے سے مکمل پرہیز کریں۔ ان کے ساتھ حق تلفی کی جائے جب بھی اپنے دنیوی مسائل کے سلسلے میں ان کے لئے واحد صحیح رویہ "صبر" ہے۔ یعنی خود اپنی تعمیری کوششوں پر بھروسہ کرنا۔ دوسروں کے خلاف احتجاج اور مطالبات کی مہم چلانے کے بجائے اپنے خداداد مواقع میں اپنے لئے رزق تلاش کرنا۔ مسلمانوں کے لئے دوسری تمام قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں ان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے کسی عمل سے ان کو اپنا سیاسی اور معاشی حریف بنا لیں۔ انہیں ان قوموں کو دعوت حق کا مخاطب بنانا ہے، نہ یہ کہ دنیوی مسائل کے نام پر ان سے جھگڑا کر کے ان کو اپنے سے دور کر دیا جائے۔

اسلامی مرکز کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کی اصل ذمہ داری کے لئے تیار کیا جائے اور موجودہ زمانہ کے تقاضوں کے لحاظ سے خدا کے پیغام کو اس کے تمام بندوں تک پہنچانے کی منصوبہ بندی کی جائے۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

مسجدیں عالم اسلامی کی نگہبان ہیں۔ مغلوں نے تیرھویں صدی عیسوی میں مشرق کی جانب سے عالم اسلام پر حملہ کیا اور اس کے بڑے حصے کو تاراج کر ڈالا۔ مگر وہی مسجدیں جن کو ہلاکو نے سمرقند سے حلب تک اپنے راستہ میں تباہ کیا تھا، اس کے پوتوں نے دوبارہ ان کی تعمیر کی اور ان کی چھتوں کے نیچے خدائے واحد کے آگے سجدہ کیا۔ مسجد ایک قسم کا دارالاسلام ہے۔ وہ اللہ کی یاد کی جگہ ہے، وہ اسلامی اتحاد کا مرکز ہے، وہ مسلمانوں کے اعتماد علی اللہ کا نشان ہے۔ جب اسلام زندہ تھا تو مسجد صرف مسجد نہ تھی بلکہ وہاں اسلامی زندگی کے تمام شعبے قائم ہوتے تھے۔ مثلاً عبادت گاہ، مدرسہ، دارالقضاء، اجتماع گاہ، اسپتال، کتب خانہ، مسافر خانہ، تبلیغی مرکز، مقام مشورہ وغیرہ ——— اسلامی مرکز میں ہم چاہتے ہیں کہ مسجد کو دوبارہ اس کی اصل حیثیت میں زندہ کریں۔

راقم الحروف نے ہفت روزہ الجمعیۃ ۲۷ نومبر ۱۹۷۰ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں مسلمانوں کی پچھلی ڈیڑھ سو سالہ کوششوں کا جائزہ لینے کے بعد کہا گیا تھا کہ اس مدت میں بے شمار بڑی بڑی تحریکوں کے وجود میں آنے کے باوجود اسلام کو زندہ نہ کیا جا سکا۔ اس سلسلہ میں تجزیہ کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ اس ناکامی کی واحد بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارے مصلحین کی کوششوں کا رخ تعمیر کے بجائے سیاست کی طرف رہا۔ آخر میں یہ تجویز درج تھی:

"موجودہ حالات میں احیائے اسلامی کے کام کا آغاز جہاں سے ہونا چاہئے، اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ اعلیٰ پیمانہ پر ایک اسلامک سنٹر کا قیام عمل میں لایا جائے۔ یہ اسلامک سنٹر ہر قسم کے عصری ذرائع سے اس قدر مسلح ہو کہ وہ تمام مسلمانوں کے لئے پاور ہاؤس کا کام دے۔ وہ اسلامی بھی ہو اور عالمی بھی اور جدید بھی۔ (صرف ایک استثناء کے ساتھ: وہ کسی بھی معنی میں سیاسی نہ ہو)"

اس تجویز کو پچھلے چھ برسوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ یہ پورا مضمون عربی میں ترجمہ ہو کر ۲۲ صفحات کے کتابچہ کی شکل میں قاہرہ اور بیروت سے شائع ہوا اور اس کے متعدد ایڈیشن نکل گئے۔ علمی و دینی جرائد میں اس کے بارے میں نہایت حوصلہ افزا تبصرے شائع ہوئے۔

اب مختلف حضرات کے شدید اصرار پر اسلامی مرکز کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ الرسالہ اسی کے ترجمان کے طور پر نکالا جا رہا ہے۔ تاہم سب سے بڑا مسئلہ اس کے لئے جگہ کی فراہمی ہے۔ فی الحال عارضی طور پر اس کا دفتر ایک مکان میں رکھا گیا ہے۔ مگر اس کی وسعت اور اہمیت کے اعتبار سے ضروری ہے کہ اس کے لئے مستقل عمارت ہو جہاں اس کے تمام شعبوں کو زیر عمل لایا جا سکے۔

بہتر یہ ہے کہ یہ مرکز کسی مسجد کے ماحول میں قائم ہو۔ کوئی قدیم مسجد ہو تو اس کے گرد و پیش کرے تعمیر کرائے جائیں اور اگر خالی جگہ ملے تو وہاں مسجد کے ساتھ ضروری تعمیرات کرائی جائیں۔ اس سلسلے میں جو لوگ کسی قسم کا تعاون کر سکتے ہوں وہ تفصیلات سے مطلع فرمائیں۔

داعی نہ سیاح ہوتا نہ شعبدہ باز، وہ اپنے مدعو گروہ کے درمیان اسی طرح کام کرتا ہے جس طرح ایک باغبان اپنے باغ میں

ایڈیٹر کے نام

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب تسلیم

الرسالہ کا پہلا شمارہ نظر سے گزرا۔ رسالہ میں کئی مضامین جزوی یا کلی طور پر محل نظر ہیں۔ لیکن اس وقت خاص طور پر "سوال و جواب" کے حصے کے متعلق کچھ گزارشات پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے جناب والا اگلے شمارے میں وضاحت فرمائیں گے۔

آپ فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں کا کوئی الگ کلچر ہی نہیں" اور "داعی کے مشن کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے مدعو سے کلچرل یگانگت پیدا کرے نہ کہ کلچرل بے گانگی"

اگر مندرجہ بالا اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو ان احادیث کی آپ کی نظر میں کیا حیثیت ہے جن میں تشبہ بالیہود سے منع فرمایا گیا ہے۔ ثانیاً کیا داعی اور مدعو کے کلچرل یگانگت کا تقاضہ یہ بھی ہوگا کہ اگر کسی "برہنہ کلب" کے ممبر یا ایسے شخص کو دعوت دینی ہو جو عورتوں کی طرح سر پہ چوٹی رکھتا ہو تو کیا اِن سے بھی داعی کو کلچرل یگانگت پیدا کرنی چاہیے۔ نیز یہ کہ یکے بعد دیگرے اگر مختلف کلچرل گروہوں کو دعوت پیش کرنی ہو تو کیا داعی کو بار بار اپنی وضع قطع میں تبدیلی کرنا پڑے گی۔

ایک اور بات وضاحت طلب ہے۔ اور وہ یہ کہ سورہ انعام کی آیت ۹ کے ترجمے میں آپ نے "لباس پہنانے" کا جو مفہوم شامل کیا ہے۔ کیا تمام مفسرین خلف و سلف اس کا ترجمہ اسی طرح کرتے آئے ہیں یا یہ آپ کی ذاتی تحقیق ہے؟

کیا میں امید کروں کہ قارئین کے استفادہ کے لئے آپ ان امور کا مبسوط جواب آئندہ شمارے میں شریک اشاعت فرمائیں گے۔

صبیح الدین احمد ایم اے
بٹلا ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

الرسالہ: "کلچرل یگانگت" کی بات ہم نے اس لفظ کے اجمالی مفہوم میں کہی ہے نہ کہ انتہائی مفہوم میں۔ اور یہ زبان و ادب کا عام طریقہ ہے۔ پیغمبروں کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وہ سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے (فرقان۔ ۲۰) ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا کام بس یہ تھا کہ کھانا کھائیں اور بازاروں میں چلتے رہیں۔ اسی طرح اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اکل طعام اور مشی فی الاسواق کی تمام رائج قسموں میں ہر اعتبار سے وہ مکمل طور پر دوسروں کی مانند تھے۔ بات خواہ عمومی الفاظ میں کہی جائے، وہ ہمیشہ کسی خاص مفہوم ہی میں ہوتی ہے، اور موقع کلام اس کے حدود کو متعین کرتا ہے۔

وہ چیزیں جو شریعت میں حرام ہیں، مثلاً برہنگی، وہ ہمارے مسلمہ عقیدہ کے مطابق خود بخود یگانگت کے عموم سے خارج ہو جائیں گی۔ اسی طرح جو چیزیں کسی گروہ کا مذہبی شعار ہوں، مثلاً صلیب کا نشان، ان میں بھی یگانگت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہر مذہب کے اپنے مخصوص مذہبی شعار ہوتے ہیں اور کوئی مذہب

ان میں کبھی سمجھوتہ کی اجازت نہیں دیتا (تشبہ بالیہود سے ممانعت اسی دوسرے مفہوم میں ہے) تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ غیر مسلم کا جوتا گول کنارے کا ہے تو ہم نوک دار کنارے کے جوتے کو اسلامی جوتا سمجھیں۔ یا غیر مسلم گھروں میں پیتل کا برتن رائج ہو تو ہم تانبے کے برتن کو اسلامی آداب قرار دیں۔ الرسالہ (اکتوبر ۱۹۷۶) میں جو بات کہی گئی تھی، وہ بس اسی محدود مفہوم کے اعتبار سے ہے اور ہندستان میں جنوب کے علاقہ کے مسلمانوں کی زندگی اس کی ایک مثال ہے۔

۲۔ سورۂ انعام کی آیت ۹ کے سلسلہ میں عرض ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس اور ان کے شاگردوں سے اس سلسلے میں تین تفسیریں منقول ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں لبس بمعنی التباس ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالے فرشتوں کو رسول بناکر بھیجتا تب بھی ان کو انسان کی صورت میں بھیجتا اور مخاطبین کو پھر وہی اشکال ہوتا جو اشکال وہ اب کر رہے ہیں۔ اکثر مفسرین نے اسی مفہوم کو اختیار کیا ہے، دوسرا مفہوم تحریف کا لیا گیا ہے اور اہل کتاب کو اس کا مصداق قرار دیا گیا ہے (تفسیر طبری)

تیسری رائے وہ ہے جس کو ہم نے الرسالہ میں نقل کیا ہے۔ تفسیر کی جو کتاب عبداللہ بن عباس کی طرف منسوب ہے، اس میں اسی رائے کو اولیت دی گئی ہے یہاں ہم اس کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

(ولو جعلناہ) یعنی الرسول (ملکا لجعلناہ رجلا) فی صورۃ رجل آدمی حتی یقدروا ان ینظروا الیہ (وللبسنا علیہم) علی الملائکۃ (مایلبسون) مثل مایلبسون من الثیاب۔ (تفسیر عبداللہ بن عباس، مطبع محمدی، ۱۲۸۰ھ

اگر ہم رسول کو فرشتہ بناتے تو اس کو بھی آدمی کی صورت میں بھیجتے تاکہ وہ اس کو دیکھ سکیں اور ان فرشتوں کو وہی کپڑے پہناتے جو کپڑے یہ لوگ پہنتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مفسرین میں مولانا حمیدالدین فراہی نے آیت کا یہی مفہوم لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

قد جعل اللہ الانبیاء ھداۃ خلقہ فالبسہم لباس البشریۃ ۔۔۔ النبی یبعث فی قوم لیصلحہم ویدعوہم الی الصراط المستقیم، فلا بد ان یکون مثلہم فی الزی والشمائل والا کان خلاف البعثۃ کما قال: ولو جعلناہ ملکا لجعلناہ رجلا وللبسنا علیہم مایلبسون

القائد الی عیون العقائد، ۳۱-۱۳۰

اللہ نے پیغمبروں کو اپنی خلق کا ہادی بنایا ہے۔ اس لئے انھیں بشری لباس پہنایا۔ پیغمبر کسی قوم میں اس لئے آتا ہے کہ اس کی اصلاح کرے اور اس کو صراط مستقیم کی طرف بلائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پوشاک اور عادات میں انھیں کی طرح ہو۔ ورنہ مقصد بعثت کے خلاف ہوگا۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے ۔۔۔

۳۔ "یکے بعد دیگرے اگر مختلف کلچرل گروہوں کو دعوت پیش کرنی ہو تو کیا داعی کو بار بار اپنی وضع قطع میں تبدیلی کرنا پڑے گی" —— یہ اعتراض بتاتا ہے کہ دعوت اسلامی کے کام کو صحیح طور پر سمجھا نہیں گیا ہے۔ دعوت کوئی شعبدہ بازوں کا تماشا نہیں ہے کہ آج یہاں دکھایا جائے اور کل وہاں۔ وہ ایک انتہائی سنجیدہ اور انتہائی طویل عمل کا نام ہے۔ داعی سیاح نہیں یا عیان ہوتا ہے۔ وہ ایک مخاطب گروہ کا تعین

کر کے اس کے ساتھ اپنے کو وابستہ کر دیتا ہے۔

وہ اس کا بخوبی مطالعہ کر کے اس کو سمجھتا ہے، حقیقت پسندی کے تمام تقاضوں کے مطابق وہ ان کے درمیان کام کا نقشہ بناتا ہے۔ وہ ان کے اوپر ان کا خیر خواہ بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ ان کو راہ حق پر لانے کے لئے اپنی ساری عمر لگا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایک کام کسی خاص گروہ کا پابند ہو کر ہی انجام دیا جا سکتا ہے، نہ اس طرح کہ روزانہ نئے نئے گروہوں کے سامنے اپنا جلوہ دکھایا جائے۔ یہ ایک قسم کا حوالگی و سپردگی کا معاملہ ہے نہ کہ تقریری مشاعروں کے دعوت نامے قبول کرنے کا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے اپنی دعوت کے لئے کسی مستقل مدعو کا انتخاب نہیں کیا ہے، وہ سرے سے داعی ہی نہیں ہے۔ دعوت تو پوری عمر کا ایک فیصلہ ہے۔ اُس کو اس تلون کے ساتھ کس طرح انجام دیا جا سکتا ہے کہ آدمی ہر دن کسی نئے مقام پر تقریری کرتب دکھانے کے لئے پہنچ جائے۔

پھر بھی ان کے بستر کانٹوں کے بستر نہیں بنے

مشہور پلے بیک سنگر موکیش چندر ماتھر (۱۹۷۶ــ۱۹۲۳) امریکہ کے ایک سفر میں تھے کہ اچانک انتقال کر گئے۔ ان کے حالات جو اخباروں میں آئے ہیں، ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ اردو زبان بہت اچھی جانتے تھے۔ ابتداءً وہ ہندی سے ناواقف تھے۔ بعد کو اپنے پیشہ کی ضرورت کے تحت سخت محنت کر کے ہندی زبان سیکھی۔ کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی میں جو دس ہزار گانے ریکارڈ کرائے ہیں، ان میں سے ایک تلسی داس کی رامائن بھی ہے جس کو انھوں نے تین سال میں مکمل کیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں ہندستان آزاد ہوا تو برادران وطن میں اسی طرح کے بے شمار لوگ تھے جنھوں نے اپنے اسکولوں میں اردو پڑھی تھی۔ پنجابیوں کا سیلاب یہاں پہنچا تو اس طرح کے لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ آزادی کے انقلاب کے بعد تقریباً چوتھائی صدی تک اس ملک کی عام زبان اردو ہی تھی۔ ہم نہایت آسانی کے ساتھ اردو کے ذریعے ان سب لوگوں تک خدا کا وہ پیغام پہنچا سکتے تھے جس کے پہنچانے کی لازمی ذمہ داری ہمارے سپرد کی گئی ہے۔

اب یہ لوگ اٹھتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ دوسری نسل لے رہی ہے۔ داعی اور مدعو کے درمیان لسانی بعد بڑھتا جا رہا ہے۔ جو کام پہلے ہم اپنی مادری زبان میں کر سکتے تھے، اس کے لئے اب ہم کو دوسری زبانیں سیکھنی ہیں اور ان کے اندر مہارت پیدا کرنا ہے۔ ایک کام جو پہلے آسان تھا، مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود لوگ راتوں کو اطمینان کی نیند سوتے ہیں، ان کے بستر ان کے لئے کانٹوں کے بستر نہیں بنے۔ شاید انھیں یاد نہیں رہا کہ ان کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد خدا کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ جب خدا پوچھے گا کہ تم نے ہمارا پیغام ہمارے بندوں تک کیوں نہ پہنچایا تو ہم کیا جواب دیں گے۔ اور اگر ہم کو "خدا کی گواہی چھپانے" کا مجرم قرار دے دیا جائے جس کے مجرم یہودی قرار دیئے گئے تھے تو ہمارے پاس اس سے بچنے کی کیا سبیل ہوگی۔

فہرست

حکمت کی باتیں ۱
جامع مسجد کی سیڑھیوں سے ۲
ابھی تک دستکاری کے دور میں ۳
پانچویں نہ بنو ۵
ڈیڈ سی اسکرول ۶
ہمارے اور آخرت کے درمیان ۸
فرشتے ہر وقت بتا رہے ہیں ۹
مطالعہ کتب ۱۱
خوابوں کے قریب میں ۱۲
ٹھیکہ مل گیا ۱۳
مہا بھارت سے ۱۴
تاج محل کو دیکھ کر ۱۴
شاعری اور تصنیف کا فرق ۱۶
صنعتی کثافت کا مسئلہ ۱۸
کیا یہ لوگ بچے ہیں ۲۰
ایک نے کیچڑ دیکھا، دوسرے نے ستارے ۲۱
نظریۂ ارتقاء ۲۲
اسلامی کردار ۲۵
مرد و عورت کے درمیان تقسیم عمل ۲۶
غلطی کا انجام ۲۷
موت کے بعد ۲۸
لارڈ ٹامسن کا واقعہ ۳۱
جاپانی کا قبول اسلام ۳۲
مواقع کی بربادی ۳۵
لطیفہ ۳۵
جدید مسئلہ کیا ہے ۳۶
دنیا داری اس کا محرک ہے ۴۲
اسلام کا مطلب ۴۲
اختلاف کے نقصانات ۴۳
تعمیر ملت ۴۴
آواز ۴۷
عربی ہفت روزہ کا تبصرہ ۴۸
ایک ملاقات ۵۱
سوال و جواب ۵۶
امریکہ میں مذہب ۵۷
اسلامی مرکز ۵۸
ایڈیٹر کے نام ۶۰
نازک مسئلہ ۶۲

اعلان

۱۔ الرسالہ کے لئے رجسٹری یا زر اعانت بھیجتے ہوئے پتہ پر شخصی نام نہ لکھیں بلکہ تمام چیزیں منیجر الرسالہ کے نام روانہ فرمائیں۔

۲۔ ایجنٹ حضرات کے لئے مطلوبہ پرچے ۲۵ فی صد کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ ہوں گے۔ ڈاک خرچ ادارۂ الرسالہ کے ذمے ہوگا